ماہنامہ
براہِ راست
لاہور
جلد 12 شمارہ 09
ستمبر 2026ء

خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے!
— ڈاکٹر خالد قدومی —

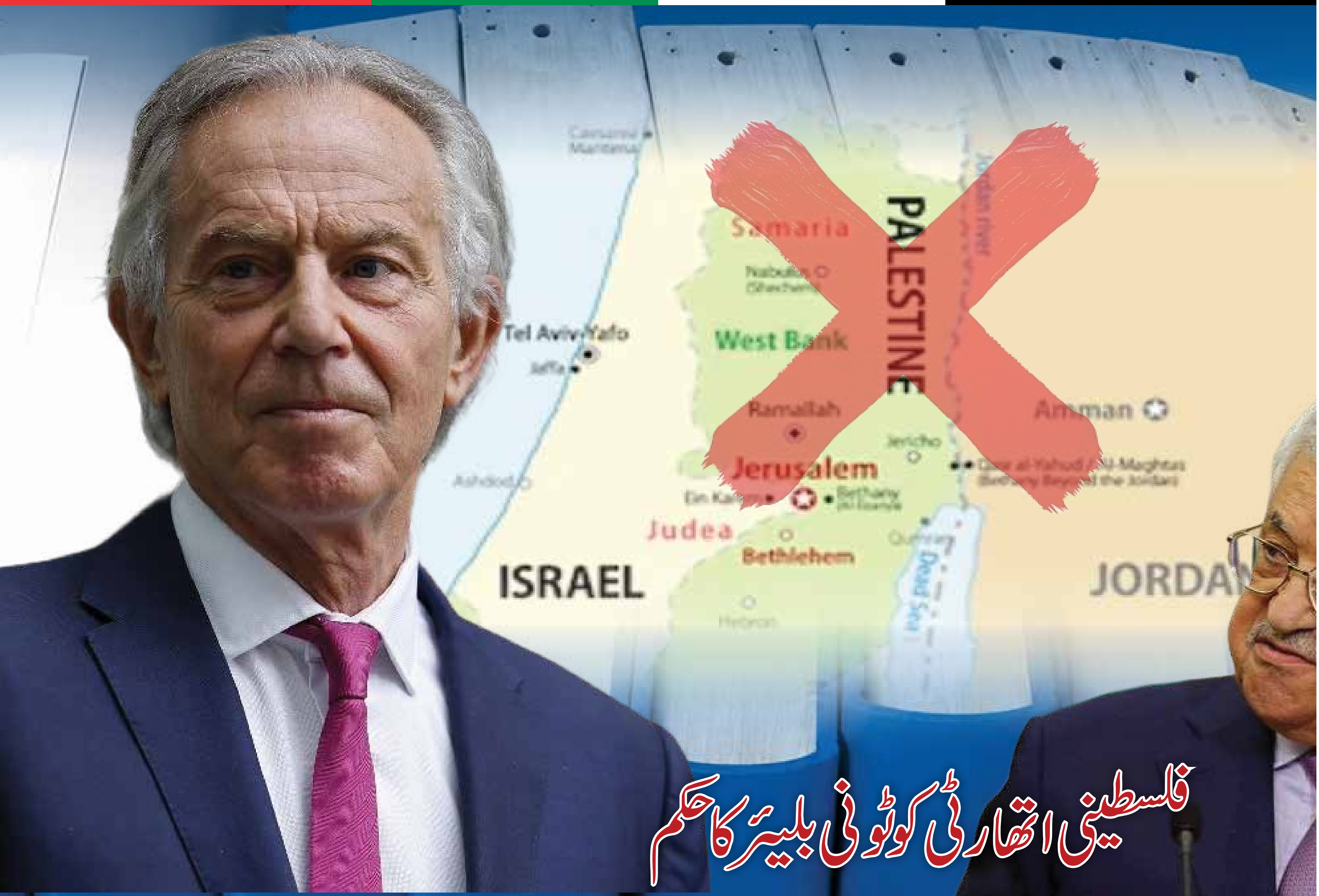

فلسطینی اتھارٹی کو ٹونی بلیئر کا حکم

نصابی کتب میں سے ''فلسطین'' غائب کردیں

اسرائیلی جارحیت: چہرا روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

ہم اہلِ غزہ کو کب اور کیسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں؟

نازی جرمنی اور نسل پرست اسرائیل پالیسیاں

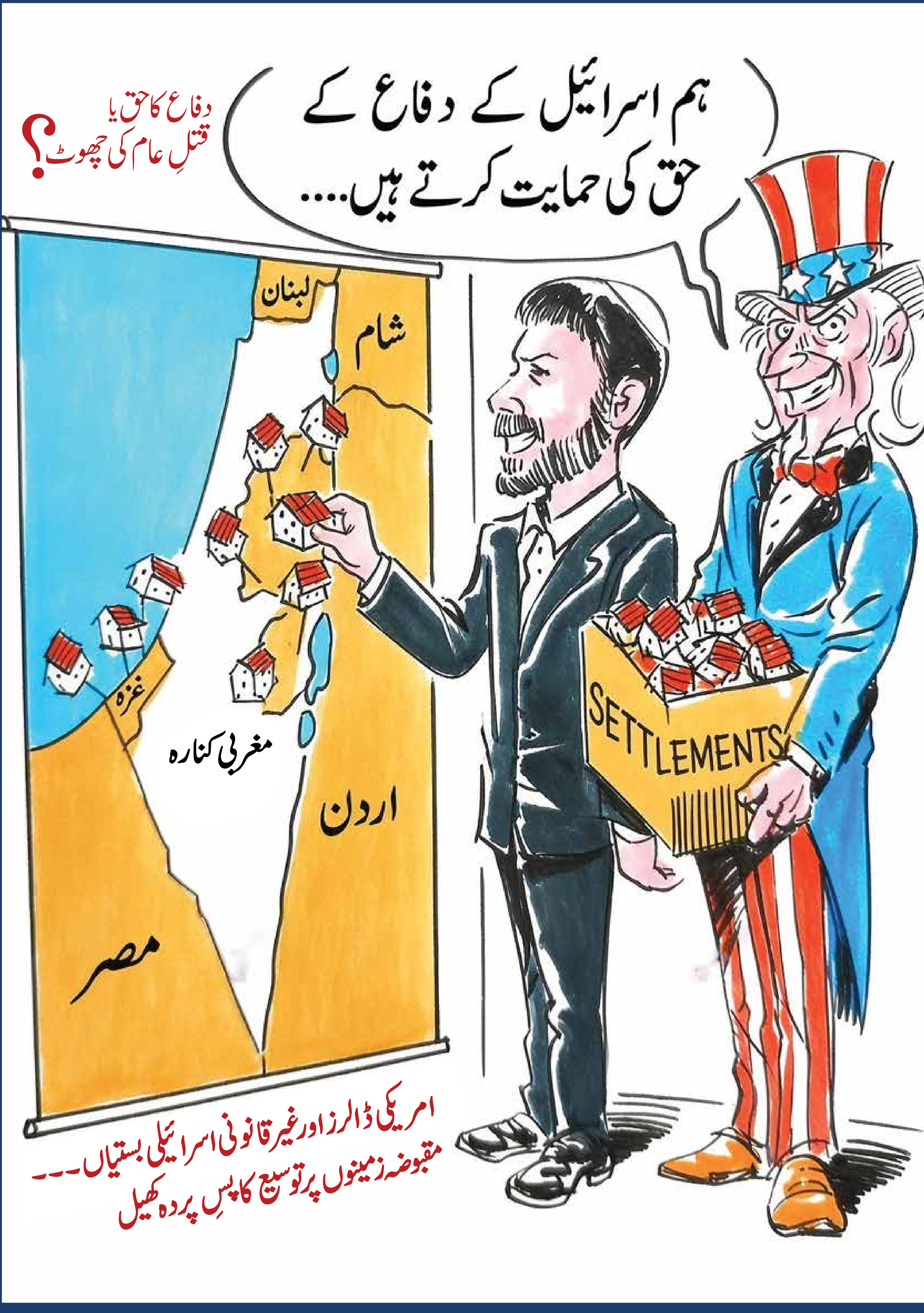
دفاع کا حق یا
قتلِ عام کی چھوٹ؟
ہم اسرائیل کے دفاع کے حق کی حمایت کرتے ہیں....
لبنان
شام
غزہ
مغربی کنارہ
اردن
مصر
SETTLEMENTS
امریکی ڈالرز اور غیر قانونی اسرائیلی بستیاں---
مقبوضہ زمینوں پر توسیع کا پسِ پردہ کھیل

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
وہ (ذات) پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام یعنی (خانہ کعبہ) سے مسجد
اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں لے گیا تاکہ ہم
اسے اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں۔ بیشک وہ سننے والا (اور) دیکھنے والا ہے۔

ماہنامہ
براہِ راست
لاہور

جلد 12 شمارہ 09
ستمبر 2026ء

مُدیر: مرزا محمد الیاس

ویب سائٹ: www.barah-i-rast.com
برقی پتہ ادارتی امور: editor@barah-irast.com
برقی پتہ انتظامی امور: contact@barah-i-rast.com

Price Rs.70

پبلشر مرزا محمد الیاس نے شرکت پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر 9/1A رائل پارک لاہور سے شائع کیا

اس شمارے میں

- کلامِ اقبال
- اداریہ

خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے!

اسرائیلی جارحیت: چہرا روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

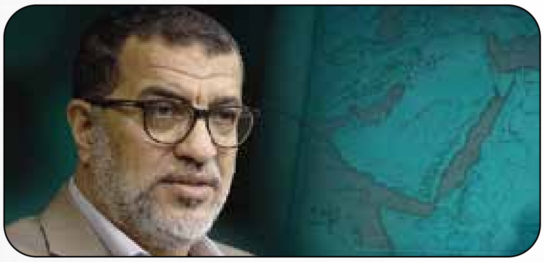

ہم اہلِ غزہ کو کب اور کیسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں؟

نازی جرمنی اور نسل پرست اسرائیل پالیسیاں

- غزہ میں اسرائیلی جارحیت ناکام
- غزہ میں تین امریکی ڈاکٹروں نے کیا دیکھا؟
- کس طرح ہندوستان نے غزہ جنگ میں اسرائیل کی عسکری مدد کی
- صہیونی ریاست کا اصل چہرہ
- ہمارے قلم اسرائیل کے لیے حاضر ہیں
- سیف الاعظم: عظیم گمنام پاکستانی ہیرو
- فلسطین کا اصل نقشہ: ہاکان پر دجال برہم
- تاریخ مسجد اقصیٰ

کلامِ اقبال

پیامِ صبح

اُجالا جب ہوا رخصت جبین شب کی افشاں کا
نسیمِ زندگی پیغام لائی صبحِ خنداں کا

جگایا بلبلِ رنگیں نوا کو آشیانے میں
کنارے کھیت کے شانہ ہلایا اس نے دہقاں کا

طلسمِ ظلمتِ شب سورۂ والنّور سے توڑا
اندھیرا میں اُڑایا تاجِ زَر شمعِ شبستاں کا

پڑھا خوابیدگانِ دَیر پر افسونِ بیداری
برہمن کو دیا پیغام خورشید درخشاں کا

ہوئی بامِ حرم پر آ کے یوں گویا مؤذن سے
نہیں کھٹکا ترے دل میں نمودِ مہرِ تاباں کا

پکاری اس طرح دیوارِ گلشن پر کھڑے ہو کر
چٹک او غنچۂ گل! تو مؤذن ہے گلستاں کا

دیا یہ حکم، صحرا میں چلو اے قافلے والو
چمکنے کو ہے جگنو بن کے ہر ذرہ بیاباں کا

سوئے گورِ غریباں جب گئی زندوں کی بستی سے
تو یوں بولی نظارہ دیکھ کر شہرِ خموشاں کا

ابھی آرام سے لیٹے رہو، میں پھر بھی آؤں گی
سُلا دوں گی جہاں کو، خواب سے تم کو جگاؤں گی

اداریہ

فلسطین کو نصاب سے خارج کرنے کا معاملہ

امریکی صدر ڈونلڈ جے ٹرمپ کی ہدایات اور بنجمن نیتن یاہو کے اشارے پر سابق وزیر اعظم برطانیہ ان دنوں مغربی کنارے میں متحرک ہیں۔ انہوں نے رام اللہ میں فلسطینی اتھارٹی کے تاحیات صدر ابو ماذن محمود عباس سے گزشتہ دنوں خصوصی ملاقات کی ہے۔ اس ملاقات میں بلیئر نے محمود عباس سے کہا ہے کہ نصابی کتب میں سے فلسطین تذکرہ ختم کر دیا جائے۔ ''مغربی کنارے'' کی جگہ ''سماریہ'' کے الفاظ تحریر کیے جائیں اور اسرائیل کا تیار کردہ تعلیمی نصاب پڑھایا جائے۔ مقبوضہ مشرقی بیت المقدس (یروشلم) کے 45 ہزار طلبہ وطالبات کو اسرائیلی حکام نے نئی ترمیم شدہ کتب فراہم کر دی ہیں جو سرکاری سکولوں میں بطور نصاب پڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے۔ اب محمود عباس صدر فلسطینی اتھارٹی سے بلیئر کے ذریعہ کہا گیا ہے کہ وہاں بھی یہ کتب پڑھائی جائیں۔ ان امور کا انکشاف معروف صحافی ڈیوڈ ہرسٹ نے مڈل ایسٹ آئی میں کیا ہے جو ایک تجزیے کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔

کیا ہو رہا ہے یا کیا کچھ ہونے جا رہا ہے، اس پر تبصرہ کرنے سے پہلے سابق وزیر اعظم برطانیہ سے چند سوالات کرنا ضروری ہیں۔ اولاً، کیا خیال ہے کہ شمالی آئرلینڈ، سکاٹ لینڈ وغیرہ کی نصابی کتب سے برطانیہ کا ذکر گول کر دیا جائے، دوم، کیا خیال ہے کہ آسٹریلیا کے پرچم سے برطانوی پرچم کے رنگ نکال دیے جائیں، سوم، برصغیر پاک وہند کی تاریخ سے برطانیہ یعنی تاجِ برطانیہ کا قصہ نکال دیا جائے، چہارم، ڈونلڈ ٹرمپ سے دریافت کیا جائے کہ امریکی تاریخ سے واشنگٹن کا ذکر نکال دیا جائے، نیو یارک کے عوام نے پرانے کھلاڑیوں کو شکست دے کر ظہران محمود ممدانی کو کیا میئر منتخب کر لیا ہے۔ اب اسے ریاست ہائے نیو یارک کہہ کے پکارا جائے۔

چند سوالات ٹونی بلیئر سے ذاتی طور پر دریافت کرنے کے ہیں۔ اولاً، وہ کن شرائط پر عالم اسلام کا تعاقب کرنے سے باز رہ سکتے ہیں۔ دوم، وہ برطانیہ کے وزیر اعظم کے طور پر علاقائی تنازعات کے حل میں فوجی اور سیاسی ناکامیوں کا کیا جواز پیش کریں گے، سوم، وہ اپنے نام سے قائم ٹونی بلیئر انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے غزہ جنگ کے بعد کے نقشے اور خدوخال کے ناکام ہونے اور بورڈ آف پیس کو خود اسرائیل کی طرف سے مسترد کرنے کا کیا جواز پیش کریں گے، چہارم، ڈونلڈ ٹرمپ کے غزہ میں ساحلی تفریح گاہ (Reverea) کے ناکام ہونے کا کیا سبب پیش کریں گے جس کی ایک بڑی وجہ اسرائیلی افواج کے ییلو لائن کے اندر بفر زون وسیع کرتے کرتے 70 فیصد غزہ پر قبضے سے پیدا شدہ صورت حال ہے، پنجم، کیا ڈونلڈ ٹرمپ کے صدر بورڈ آف پیس بننے کے شوق کو انہوں نے ناکام نہیں بنایا کیوں کہ منصوبے کے تحت ان کی اپنی صدارت قبول نہ کی گئی اور پھر حماس کے انتظامی امور سے علیحدہ ہونے کے باوجود قاہرہ میں بورڈ آف پیس کے دفاتر کا کیا جواز ہے۔

یہ سب ٹونی بلیئر کی بڑی بڑی ناکامیاں ہیں۔ ان کی کامیابی کی اب امید انہیں یہ ہے کہ ایک بار ان کے، دراصل نیتن یاہو کے منصوبے کے تحت تعلیمی نصاب تبدیل ہو جائے اور فلسطینیوں کی تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا قتل شروع ہو جائے۔ گویا اب تہذیبی نسل کشی کا آغاز کر دیا جائے۔

مقبوضہ مشرقی بیت المقدس میں تعلیمی نصاب ابھی شروع کیا گیا ہے۔ کیا خیال ہے کہ ایک فلسطینی طالب علم اور اس کے والدین مان جائیں گے کہ وہ فلسطینی نہیں ہیں۔

''الکفر ملت واحدہ'' کا ذکر یونہی کیا جاتا۔ ایک لاکھ فلسطینیوں کی نسل کشی، ان کے ہزاروں بچوں کا قتل صرف ایک اسرائیل نے کیا ہے؟ کیا ہر مغربی ملک سے اسلحہ کھیپ در کھیپ اسرائیل نہیں گیا؟ کیا اس نسل کشی پر خود ان ممالک کی عوام تڑپ نہیں اٹھی؟ ذرا تاریخ پر نگاہ تو ڈالیے تو کیا الجزائر کو اپنی کالونی بنانے کے بعد قبضہ مستحکم کرنے کے لیے وہاں کے عربی رسم الخط کو فرانسیسی رسم الخط میں تبدیل اور دینی مدارس کو بند نہیں کیا گیا؟ کیا عباسی مدنی اور علی بالحاج کی مقبولیت کا راز یہ نہیں تھا کہ انہوں نے عربی زبان کو زندہ رکھنے کی تحریکوں کی ہر قسم کے لالچ، خوف اور دھمکیوں کے باوجود قیادت جاری نہیں رکھی؟ کمال اتاترک کہلانے والے مصطفیٰ کمال نے ترکی کا تہذیبی ورثہ تبدیل کرنے کے لیے سخت ترین سیکولر قوانین نافذ نہیں کیے؟ کیا شمالی افریقہ کے ملکوں کے سربراہوں نے جب اعتراف کیا کہ ان مسلمانوں کو شکست نہیں دی جاسکتی تو کیا نوآبادیاتی قوتوں نے ان ملکوں میں عوام کو قرآن سے دور اور عورت کے قریب کرنے، مسلمانوں کے کردار کو داغ دار کرنے کے لیے ظلم وستم کو بربریت قرار نہیں دیا، جسے اب بھی اسی طرح سے استعمال نہیں کیا جاتا اور انگریزی لفظ Barbarism کو اسی کے مصداق قرار نہیں دیا جاتا۔

ابھی تو ٹونی بلییئر سے بہت سے اور بھی سوالات کرنا ہیں۔ ابھی تو ان سے ان لاکھوں کروڑوں ڈالرز کا حساب طلب کرنا ہے جو انہوں نے بالخصوص مشرق وسطیٰ میں ایک طرف اسرائیل، دوسری طرف امریکہ اور تیسری طرف یہودی لابی گروں سے وصول کیے۔ ان کا تو کاروبار ہی یہی ہے۔ کیا انہوں نے عراق اور افغانستان کی تباہی میں اسی طرح کا کردار ادا نہیں کیا؟

اور پھر وہ مشورہ دینے کس کے پاس گئے ہیں جو خود سرتاپا اسرائیل کی حکومتوں کے حکم کا غلام رہا ہے۔ جس نے ہمیشہ حماس کے خلاف سازشوں میں حصہ لیا کیوں کہ حماس نے 2006ء میں آزاد جمہوری الیکشن جیتا۔ محمود عباس کے لیے یہ مشورہ نہیں ہے، باقاعدہ حکم ہے۔ اس حکم سے ذرہ بھر روگردانی پر شین بیت یا موساد کے کسی ایجنٹ کی ایک گولی ہی اس کے غلامانہ ذہن کے کئی ٹکڑے کرنے کے لیے کافی ہے۔

کیا محمود عباس نے کبھی مغربی کنارے کے فلسطینیوں پر ہونے والے یہودی آبادکاروں، اسرائیلی فوج اور پولیس کے ظلم اور قتل وغارت گری، گھروں کے جلائے اور گرائے جانے، فصلوں کو آگ لگانے کی کبھی اسرائیل کی حکومت سے شکایت بھی کی؟

کیا محمود عباس اب اس حکم نما مشورے سے فرار کا راستہ اختیار کرسکیں گے؟ اس طرح وہ فلسطینی قوم کے خلاف تعلیمی صلیبی جنگ شروع نہیں کریں گے؟ کیا فلسطین کی تاریخ، تہذیب اور وراثت اس کا ذکر نکالنے سے ختم کی جاسکے گی۔

لیکن صد افسوس کہ امت مسلمہ کا حال عرب کے ان شہزادوں کے ہاتھوں یرغمال ہے جو غزہ میں اپنے ذاتی اختیار اور کاروبار کے لیے سرگرم رہے، جو ابراہام معاہدوں کا حصہ بنے یا فلسطینی جدوجہد دیکھ کر آگے نہ بڑھ سکے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ فلسطین کا ہر فلسطینی اپنے ماضی کی ایک کتاب ہے۔ اس نے جو ظلم دیکھا ہے، وہ کسی صورت میں اپنے بچ رہنے والے بچوں کو تاریخ و جغرافیہ فراموش کرنے دیں گے۔

اسرائیل کے نیتن یاہو کو ایرانی حملوں سے بنے کھنڈرات سے نیا تل ابیب، حیفا اور دیگر شہروں کی تعمیر پر توجہ دینی چاہیے۔ اس کے دوبارہ تعمیر ہونے والے سکولوں میں یہ ضرور پڑھایا جائے گا کہ ایک نیتن یاہو نے ان پر تباہی کا راستہ کس طرح کھولا۔ وہ کیا فلسطین کو تاریخ و جغرافیہ سے محروم کرسکیں گے۔

خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے!

غزہ پر جارحیت اور اس کی مزاحمت بھی عجیب ہے۔ ایک اہم ترین حقیقت یہ ہے کہ اپنوں نے اسے معمول کی ایک جنگ سمجھا گویا کہ امریکہ اور اسرائیل سے ایران کی جنگ ہو رہی ہے۔ لوگ مزے لے لے کر تبصرے کر رہے ہیں کہ کل ایران نے بئر سبع برباد کر دیا۔ آج اس نے تل ابیب کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ مگر غزہ میں اسلامیان امت کے لیے جنگ محض کھیل نہ تھا۔

جب اکتوبر 2023ء میں کسی جارحیت کے جواب میں نہیں، بلکہ طے شدہ منصوبے کے تحت امریکہ، جرمنی، برطانیہ، فرانس اور دیگر کے اسلحہ کے انبار اسرائیل نے غزہ پر برسا دیے۔ ایک طرف ہسپتالوں، سکولوں، کلیساؤں اور مساجد پر میزائل گر رہے تھے۔ بالکل قریب ہی مقیم فلسطینیوں نے ایمانی حرارت کی آنچ تیز کر رکھی تھی۔ کسی ایک فرد کو کندھوں پر اٹھائے وہ مزاحمت کا اعلان کر رہے تھے اور کہیں خود مزاحمت کی علامت بنے ہوئے تھے۔ اسی دوران امریکہ کے وعدہ شکن اور عہد مزاحمت کی سچائیوں سے نابلد صدر ٹرمپ نے میں دو سال کی نسل کشی کے بعد 20 نکاتی امن پروگرام کا اعلان کر دیا۔

ہم اس بات کو کسی اور وقت پر اٹھائے رکھتے ہیں کہ ان کا بورڈ آف پیس کیا ہوا، انٹرنیشنل فورس کا کیا بنا، ٹونی بلیئر کدھر گئے یا کر دیے گئے وغیرہ۔ پھر اس اعلان نے سب کو چونکا ہی تو دیا تھا کہ حماس نے ٹرمپ پلان کو بعض تحفظات کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔

اسرائیل کو اصرار تھا کہ حماس کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ جو کام دو سال کی بمباری نہ کر سکی، میزائیلوں کی بارش حماس کی 80 سے زیادہ سرنگیں تباہ نہ کر سکی، وہ حماس کو غیر مسلح کیوں کر کرتی؟ پھر سوچا گیا کہ جو نتائج ایک لاکھ فلسطینی مسلمانوں کو شہید کر کے حاصل نہ ہو سکے، وہ کام مذاکرات کی میز پر سرانجام دیا جائے۔ اس کے لیے شرم الشیخ مصر میں اسٹیج سجایا گیا۔ ثالث جمع ہوئے، نام نہاد منصف آن موجود ہوئے۔ تب تک دنیا کا ٹھیکے دار امریکہ، جس کے صدر ٹرمپ کو Art of Deal لکھنے کا اعزاز حاصل ہے، وہ بھی آئے۔ سبھی آئے پر تماشا مختصر ہوا۔ اصل فریقین میں سے صرف حماس کے وفد نے شرکت کی، دوسرا اور جارح فریق اسرائیل نہ آیا۔

پھر ایک میڈیا وار کا ساتھ ہی آغاز کر دیا گیا۔ شرم الشیخ میں ٹرمپ پلان پر عمل درآمد کے ابتدائی خدوخال طے کیے گئے، ان میں نمایاں نکات یہ تھے:

۔۔ اسرائیلی فوج غزہ خالی کر دے گی اور ییلو لائن کے پار چلی جائے گی۔ اس کے لیے کہیں یہ طے نہ ہوا کہ ییلو لائن کے اندر بفر زون بنایا جائے گا۔ اس شرط کے پیچھے عراق سے شام، پھر لبنان اور مصر کے اندر بفر زون بنانے کے تجربات بول رہے تھے۔

۔۔ایک انتظامیہ غزہ کا انتظام سنبھالے گی مگر یہ کسی اعتبار سے فلسطینی اتھارٹی نہیں ہوگی۔
۔۔ایک انٹرنیشنل فورس بنائی جائے گی۔ پولیس کا محکمہ ازسرنو بنایا جائے گا جو حماس کی جگہ لے گا تاکہ غزہ میں امن وامان قائم کیا جائے (کسی نے نہیں سوچا تھا کہ امن وامان کے نام نہاد دعوے کے باوجود بھی منظم نسل کشی جاری رہی تو اس کو کون روکے گا)؟

ان نکات میں کہیں بھی ذکر نہیں کہ کس طرح اور کس مرحلے پر حماس غیر مسلح ہوگی۔ اس کے بجائے یہ کہا گیا تھا کہ علی شعت غزہ انتظامیہ کے سربراہ ہوں گے۔ یہ انتظامیہ اسرائیل نے قبول نہ کی اور اس کے دفاتر قاہرہ کے اندر چند بنکرز میں قائم کردیے گئے۔ اس دوران میں اسرائیل نے ییلو لائن کے اندر غزہ کی طرف بفرزون قائم کرلیا۔ اب غزہ کا 60 فیصد حصہ عملی طور پر اسرائیل کے قبضہ میں تھا۔ جارح کو کسی ییلو لائن کی پرواہ تھی اور نہ ہی اورنج لائن کو وہ خاطر میں لاتا تھا۔

حماس نے ٹرمپ پلان کے اگلے نکتے پر، جو شرم الشیخ میں طے ہوا تھا، دنیا کو پھر چونکنے پر مجبور کردیا۔ حماس نے غزہ کی حکومتی وانتظامی ذمہ داری نئی انتظامیہ کے حوالے کرنے کا اعلان کردیا۔ سب حیران تھے کہ:

محو حیرت ہوں دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

یہ عرصہ یونہی نہیں گزرا تھا، اسماعیل ہنیہ، یحییٰ ابو ابراہیم السنوار، ابو عبیدہ اور کئی مجاہد راہنما شہید ہوئے۔ ان کے پوتے پوتیوں، نواسے، نواسیوں اور بیٹوں نے درجنوں کی تعداد میں جام شہادت نوش کیا۔ کیا یہ شہادتیں غیر مسلح ہونے کے لیے تھیں؟

اس سے پہلے کہ حماس کے غیر مسلح ہونے یا نہ ہونے، نئی انتظامیہ کے علی شعت کی سربراہی میں غزہ آنے، نیا انتظامی ڈھانچہ تعمیر کرنے، سول انتظامیہ بحال کرنے کے اہم اقدامات کا غزہ پہنچ کر اعلان کرتی، بورڈ آف پیس کام کرتا، غزہ میں Riveria کے پرتعیش منصوبوں کا اعلان کرتا، علاقائی شہزادوں اور ایلون مسک کے منصوبے زیر بحث آئے، ٹونی بلیئر کہیں نظر آتے، اسرائیل نے فلسطینیوں کی نسل کشی جاری رکھی۔ اکتوبر 2025ء سے اب تک 5 ہزار سے زیادہ فلسطینی شہید کردیے گئے۔ کیا حماس کے غیر مسلح ہونے کا یہی موقع تھا؟

پھر ہوا کیا؟ نئی انتظامیہ اور اس کے حواری مداری جرأت ہی نہ کرسکے کہ وہ قاہرہ سے غزہ آئیں اور علی شعت کی سربراہی میں کام کریں۔ حماس نے تو نئی انتظامیہ کو پوری سپورٹ دینے کا اعلان کیا تھا، پھر نبی رحمتؐ کے نام سے موسوم حکومتی مقتدرہ کی صدر نشینی پر فائز کالم نگار اور ان کے ہم نوا دانش وروں نے حماس کے غیر مسلح ہونے کا اعلان کردیا۔ کہا اور لکھا گیا کہ "ایک ہزار مار کے ایک لاکھ ہی مروانے تھے تو اس سب کا کیا حاصل حصول؟"

غزہ کی نزاکتوں کو چھوڑیے، ہمارے یہ بزرجمہر بڑی بڑی حقیقتیں بھی جاننے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے موضوعات پر ان کا علم واجبی بھی نہیں ہوتا۔ وہ تو اب بھی اسرائیل کا یہ پروپیگنڈہ تسلیم کرتے ہیں کہ پہل حماس نے کی۔

اگر وہ ٹائمز آف اسرائیل، ہارتز اور دیگر اسرائیلی میڈیا کا ہی سرسری مطالعہ کرلیتے، امریکی میڈیا کا سچ جاننے کے لیے برطانوی میڈیا ہی پڑھ اور سن لیتے، تو صورت حال واضح ہوجاتی۔ چلیں اس کو بھی چھوڑیں، اسرائیل کے ہی مختلف چینلز پر پیش کردہ حقائق جان لیتے تو کم ازکم انہیں، بالخصوص فیس بکی دانشوروں کا یہ قبیلہ جان پاتا کہ وہ محض اسرائیل کا ٹوپی ڈرامہ تھا۔ حماس کے ہاتھوں مرنے والے اسرائیلیوں کی وہ 12 سولاشیں کہاں ہیں؟ وہ عورتوں کے برہنہ و بریدہ جسم کہاں ہیں جن کا بڑا چرچا کیا گیا۔

اکتوبر 2023ء امریکی آشیر باد کی مدد، جو بائیڈن، ٹونی بلنکن اور بنیامین نیتن یاہو کا رچایا گیا کھیل تھا۔ اس کے خلاف حماس نے ہتھیار اٹھائے اور اس کا اب یہی کہنا ہے کہ اس کے ہتھیار رکھنے حوالے نہ کرنے کی بھی ایک ہی شرط ہے کہ ٹرمپ پلان کے پہلے عمل درآمد مرحلے پر اسرائیل کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے جنگی پاگل پن کو لگام دے، فلسطینی عوام کی نسل کشی بند کرے، اب ییلو لائن یا اورنج لائن ختم کرے اور غزہ مکمل خالی کرے۔

اگر یہ اقدامات روبہ عمل آتے ہیں، نئی انتظامیہ کو غزہ آنے دیا جاتا ہے تو حماس پولیس کے نظام کا حصہ تو بن سکتی ہے، غیر مسلح نہ کی جاسکی ہے اور نہ کی جاسکے گی۔ حماس کسی صورت غیر مسلح نہیں ہوگی۔ کسی میں جرأت ہے تو آئے اور غزہ کی سرنگوں میں ایک رات ہی بسر کرکے دکھائے۔ اور سب سے پہلے اس شب بسری کا تجربہ حماس کو مطعون کرنے والے دانش مندوں کو کرنا چاہیے تاکہ وہ مجاہدین القسام بریگیڈ کے ساتھ ذکر الٰہی اور درود ابراہیمی کی تسبیح کا لطف اٹھا سکیں ورنہ کم ازکم اپنے کم علم ہونے کی سزا پوری ملت پاکستان کو نہ دیں۔

تجزیہ: ڈاکٹر سلیم خان

اسرائیلی جارحیت: چہرا روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

طوفان الاقصیٰ کے جواب میں اسرائیلی جارحیت کے ایک ہزار دن مکمل ہونے پر غزہ کے انتظامیہ نے جولرزہ خیز اعداد و شمار پیش کیے ان میں اسرائیل کے ذریعہ انجام دی جانے والی نسل کشی کے بھیانک چہرے کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ اس رپورٹ میں شہریوں اور بنیادی ڈھانچے کو وسیع پیمانے پر تباہی کے علاوہ بھوک اور جبری نقل مکانی کی تفصیل درج ہے۔ ان ہیبت ناک اعداد و شمار کے مطابق غزہ کی پٹی میں 24 لاکھ 40 ہزار سے زائد فلسطینی نسل کشی، بھوک اور نسلی تطہیر سے نبرد آزما ہیں۔ بنیادی ڈھانچے کی بات کی جائے تو پٹی کا 90 فیصد سے زائد حصہ مکمل تباہ ہو چکا ہے۔ اسرائیلی فوج نے چھاپوں، بمباری اور نقل مکانی پر مجبور کر کے 80 فیصد سے زیادہ اراضی پر عسکری قبضہ قائم کرلیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر شہری آبادی پر 241 بار بمباری کے دوران 2 لاکھ 23 ہزار ٹن سے زائد بارود برسایا گیا۔ یہ تباہ کاری کئی ایٹم بم سے زیادہ شدید ہے۔ اس کے نتیجے میں اسپتالوں کے اندر شہداء کی تعداد 73 ہزار 66 ہوگئی جبکہ 9 ہزار 500 افراد ملبے تلے دبنے یا دیگر وجوہات سے لاپتہ ہیں۔ اس تباہی کا بدترین پہلو یہ ہے کہ متاثرین میں 55 فیصد سے زائد بچے، خواتین اور بزرگ ہیں یعنی شہداء میں 21 ہزار 500 سے زائد بچے اور 12 ہزار 500 خواتین ہیں۔ ان شہداء کا تعلق 39 ہزار سے زائد خاندانوں سے تھا۔ ان میں 2 ہزار 700 خاندان مکمل طور پر مٹا دیئے گئے۔ بھوک اور غذائی قلت کے سبب 460 اور سردی سے 28 لوگ فوت ہوگئے۔ یہ سماجی بحران اس قدر شدید ہے کہ غزہ کے اندر فی الحال 58 ہزار 800 بچے یتیم اور 26 ہزار 370 خواتین بیوہ ہوچکی ہیں۔

جنگی تباہی کے دوران عوام کو راحت پہنچانے میں طبی، بلدیاتی شعبے کے اہلکار اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن اسرائیل نے انہیں خاص طور پر نشانہ بنایا تا کہ زخمیوں کو مناسب سہولت سے محروم رکھا جاسکے۔ صہیونی ظالموں نے صحت کی دیکھ بھال کے نظام پر 788 حملے کیے اور 197 ایمبولینسوں کو نشانہ بنایا گیا۔ قابض دشمن نے شہری دفاع کے 16 مراکز اور 84 ریسکیو و فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کو تباہ کر کے آگ بجھانے والے 145 شہری دفاع کے کارکنان کو شہید کردیا۔ اس بمباری کے نتیجے میں غزہ کے 38 اسپتال اور 96 مراکزِ صحت قابلِ استعمال نہیں رہے۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ایک ہزار 700 طبی عملے کے ارکان کو شہید کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک لاکھ 73 ہزار 514 زخمیوں کا پرسانِ حال نہایت قلیل عملہ مہیا تھا۔ ان زخمی لوگوں میں 19 ہزار کو طویل مدتی بحالی کی ضرورت ہے۔ ان کے علاوہ 5 ہزار 400 سے زائد افراد کے اعضاء کٹ چکے ہیں اور ایک ہزار 500 تو مستقل مفلوج ہو چکے ہیں۔ اسی طرح ایک ہزار 200 لوگوں نے اپنی بینائی گنوادی ہے۔ نقل مکانی کے باعث 21 لاکھ سے زائد افراد متعدی بیماریوں کا شکار ہوئے، جبکہ ہیپاٹائٹس کے 71 ہزار 338 کیسز ریکارڈ کیے گئے۔

موت اور بیماری کے علاوہ تیسرا سنگین بحران نقل مکانی کا ہے۔ ان حملوں نے 20 لاکھ سے زائد فلسطینیوں کو نقل مکانی پر مجبور کیا گیا کیونکہ 5 لاکھ 10 ہزار مکانات متاثر ہوئے۔ ان میں سے 3 لاکھ 35 ہزار تو مکمل طور پر تباہ ہوگئے۔ اس لیے 3 لاکھ 50 ہزار سے زائد خاندانوں کو رہائش کی ضرورت ہے۔ انسانی زندگی کی دیگر ضروریات مثلاً سینکڑوں کنویں، پانی، بجلی اور سیوریج کے نیٹ ورک کو برباد کیا گیا۔ ہزاروں کلومیٹر سڑکیں، سرکاری عمارتیں، کھیلوں کے مراکز اور آثار قدیمہ کے مقامات تباہ کردیئے گئے۔ گھروں کے علاوہ عبادتگاہوں کی بات کریں تو ایک ہزار 47 مساجد کو مکمل طور پر اور 210 کو جزوی طور پر تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس تباہ کاری کا شکار گرجا گھر اور قبرستان بھی ہوئے۔ پانچویں صدی کا چرچ آف سینٹ پورفیریوس دنیا کا تیسرا قدیم ترین گرجا گھر منہدم ہوگیا۔ اسی

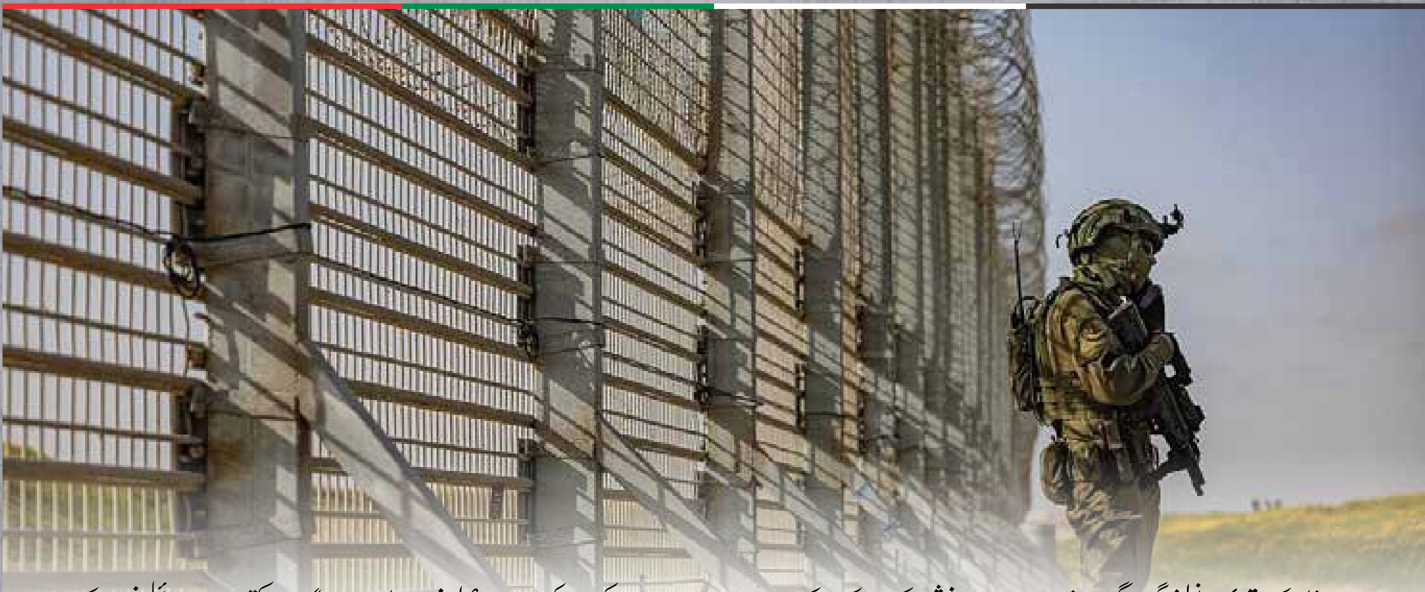

زمانے کا ایک قدیم بازنطینی گرجا گھر جو شاندار اور نایاب فرش کے موزیک کے سبب دنیا بھر میں مشہور تھا نشانہ بنا۔ 1882 میں تعمیر ہونے والا غزہ بیپٹسٹ چرچ کو بھی صہیونیوں نے نہیں چھوڑا اور غزہ شہر میں واقع واحد کیتھولک ہولی فیملی چرچ کو بھی نقصان پہنچا۔ اس کے باوجود مغربی دنیا کے عیسائیوں کی اسرائیل کو حمایت قابلِ شرم تھی۔ غزہ کے 60 میں سے 40 قبرستان تباہ کیے گئے بلکہ 2 ہزار 450 سے زائد لاشوں کی چوری کا بھی شرمناک انکشاف ہوا۔

غزہ نہایت زرخیز علاقہ ہے لیکن جنگ کے سبب زرعی پیداوار میں 87 فیصد کمی آئی ہے۔ ابتدائی براہِ راست نقصانات 80 ارب ڈالر کا تخمینہ لگایا گیا ہے، جو غزہ کی پٹی میں زندگی کے ہر پہلو کو پہنچنے والی معاشی تباہی کا عکاس ہے۔ تعلیم کے اعتبار سے عرب دنیا میں فلسطینی سب ممتاز ہیں۔ غزہ جیسے مختصر علاقہ میں بے شمار تعلیمی ادارے اور کئی یونیورسٹیاں تھیں۔ اسرائیلی جارحیت 81 فیصد اسکولوں کی متاثر کیا اور انہیں دوبارہ تعمیر یا بنیادی بحالی کی ضرورت ہے۔ 17 اعلیٰ تعلیمی ادارے تباہ کر دیئے گئے، 20 ہزار سے زائد طلبا اور 830/اساتذہ کی شہادت سے تعلیم کے شعبے کی تباہی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے 6 لاکھ 20 ہزار اسکولی طلبا اور 90 ہزار یونیورسٹی کے طالب علموں کو اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑا ہے۔ آزمائش کی اس گھڑی میں اقوام متحدہ سمیت دنیا بھر کے دردمند لوگ غزہ والوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں مگر سرحدوں کو 650 دنوں سے بند کر کے رکھا گیا ہے۔ اس دوران 3 لاکھ 90 ہزار امدادی ٹرکوں کو غزہ میں داخل ہونے سے روک کر خوراک کی تقسیم کے مراکز کو براہِ راست نشانہ بنایا گیا۔ اس سفاکی کے سبب 6 لاکھ 50 ہزار غذائی قلت کا شکار بچوں میں 40 ہزار شیر خوار شامل ہیں۔ 22 ہزار سے زائد مریضوں کو علاج کے لیے باہر جانے سے روکا جا رہا ہے۔ صہیونی یہودیوں اور ان کے حامی سفید فام نسل پرستوں کو اپنے جمہوری نظام پر بہت ناز ہوا کرتا تھا مگر غزہ کی تباہی نے ان کے چہرے پر پڑی خوبصورت جمہوریت کی نقاب نوچ کر پھینک دی ہے۔ علامہ اقبال نے یہی تو کہا تھا۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرا روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

جنگ کے دوران جارح اقوام احساسِ جرم اور انانیت کے سبب اپنے نقصان کو کم کر کے بیان کرتی ہیں جبکہ مجروح لوگ برائے ہمدردی بڑھا چڑھا کر یا کم از کم سچ سچ بیان کر دیتے ہیں۔ اس کشمش کے ایک ہزار دن کی تکمیل پر اسرائیل کی وزارت جنگ نے بھی چند اعترافات کیے ان کی مدد سے اصل نقصان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسرائیلی فوج کے تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق، غزہ کی پٹی پر جنگ کے آغاز سے اب تک 964/افسر اور فوجی ہلاک ہو چکے ہیں، جبکہ 6 ہزار 424 زخمی ہوئے ہیں۔ اسرائیل نے سرکاری طور پر اپنی عسکری کارروائیوں کے دوران جو جانی اور مادی نقصانات کی معلومات جاری کی ہیں ان پر سخت فوجی سنسر شپ کے سبب اعتبار کرنا بہت مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں مبصرین نقصانات کے ان اعداد و شمار پر یقین نہیں کرتے۔ اسرائیلی فوج نے دورانِ جنگ 262 صحافیوں کو شہید کر دیا تا کہ حقائق کو چھپایا جا سکے۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ جب ایک رہائشی عمارت بمباری سے تباہ ہوگئی تو برج موہن سنگھ نامی ایک ہندوستانی رپورٹر جائے واردات پر پہنچ گیا۔ وہ جب تفتیش کے لیے اندر جانے لگا تو اسے اہلکاروں نے یہ کہہ کر بھگا دیا گیا کہ جاؤ لکھ دو کہ دو افراد ہلاک ہوئے۔

اسرائیلی حکام نے جانی نقصان کی تعداد کو تو چھپایا گیا مگر زخمیوں اور نفسیاتی امراض کا شکار لوگوں کی بابت بہت سارے اعداد و شمار جاری کر دیئے گئے۔ اسرائیل کی سرکار نے تسلیم کیا کہ غزہ کی پٹی پر جنگ کے آغاز سے اب تک فوج کے تقریباً 26 ہزار 200 اہلکاروں نے علاج کروایا۔ ان میں سے 65 فیصد افراد نفسیاتی عوارض کا شکار ہیں۔ رپورٹ میں آگے کہا گیا کہ ان مریضوں تعداد تقریباً 17 ہزار ہے جبکہ 7 ہزار 700 جسمانی زخموں کے شکار ہیں، جن میں 97/افراد کے اعضاء کٹ چکے ہیں۔ یہاں گڑبڑ یہ ہے جسمانی طور پر زخمی اگر 35 فیصد ہے تو وہ تعداد 9170 ہونی چاہیے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ جن فوجیوں کے سر پر ہوائی حملوں کی چھتری ہوتی تھی اور جو سر سے پیر تک ہتھیاروں سے اس طرح لیس ہوتے تھے کہ چہرا تک دیکھنا مشکل ہو ان کی اتنی بڑی تعداد کو حماس کے مجاہدین نے زخمی کیا۔ سچائی تو یہ ہے کہ اصل تعداد کئی گنا زیادہ ہوگی۔ سرکاری رپورٹ کے مطابق 92 فیصد زخمی مرد ہیں، جن میں سے 48 فیصد کی عمریں 30 سال سے کم، 30 فیصد کی عمریں 30 سے 39 سال کے درمیان، جبکہ 22 فیصد کی عمریں 40 سال سے زیادہ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے تربیت یافتہ معمر فوجیوں نے کم عمر نوجوانوں کو مرنے کے لیے آگے کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیل میں جذبۂ شہادت سے عاری زبردستی کے فوجی میدان جنگ سے بھاگتے ہیں۔ ایسے بزدل حماس کے شیر دل مجاہدین کے سامنے کیا ٹکیں گے جن کی بابت علامہ اقبال نے فرمایا۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

ہم اہلِ غزہ کو کب اور کیسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں؟

کسی مظلوم قوم کی مدد صرف اس وقت نہیں ہوتی جب ہم اس کے لیے الفاظ ادا کریں، جذباتی بیانات دیں یا اس کے حق میں چند رسمی سرگرمیاں انجام دیں۔ اصل مدد یہ ہے کہ جب اہلِ حق آزمائش کے انتہائی کڑے مرحلے میں ہوں، جب بھوک ان کے گھروں تک پہنچ چکی ہو، جب خون بہہ رہا ہو اور انہیں فوری سہارے کی ضرورت ہو، تو ہم اپنی استطاعت کے مطابق ان کے ساتھ کھڑے ہوں۔

خذلانِ عظیم یہ ہے کہ انسان جانتے بوجھتے اہلِ ثغر کو اس وقت تنہا چھوڑ دے جب انہیں فوری نصرت اور عملی مدد کی سب سے زیادہ ضرورت ہو۔

1۔ جب آپ ان کی مدد کے لیے آگے نہیں بڑھتے:

آپ ان کا ساتھ اس وقت چھوڑ دیتے ہیں جب آپ جانتے ہیں کہ وہ شدید بھوک، محاصرے اور خونریزی کا سامنا کر رہے ہیں، مگر اس کے باوجود ان کی فوری مدد کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق کچھ نہیں کرتے۔ آپ جانتے ہیں کہ تاخیر کے نتیجے میں مصیبت مزید سنگین ہو سکتی ہے، لیکن پھر بھی آپ انتظار کرتے رہتے ہیں۔

2۔ جب آپ ان کی آواز کے بجائے ان پر سوال اٹھاتے ہیں:

آپ ان کا ساتھ اس وقت بھی چھوڑ دیتے ہیں جب آپ عوام کے سامنے ان کی بات کو تسلیم کرنے کے بجائے ان کی روایت اور مؤقف کو مشکوک بناتے ہیں، ان کی جدوجہد اور استقامت پر سوال اٹھاتے ہیں، ان کے فیصلوں اور اجتہادات کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں اور مصیبت کے وقت انہیں ہی ان کے حالات کا ذمہ دار قرار دینے لگتے ہیں۔

اختلافِ رائے اپنی جگہ، لیکن بحران اور ابتلا کے عروج پر ایسے سوالات اٹھانا جو حوصلہ توڑ دیں اور مدد کے بجائے ملامت کو جنم دیں، اہلِ مصیبت کے لیے مزید بوجھ بن جاتا ہے۔ اختلاف کا جائز وقت مصیبت کے ٹل جانے کے بعد بھی آ سکتا ہے۔

3۔ جب وعدے بہت اور عمل کچھ نہیں ہوتا:

آپ ان کا ساتھ اس وقت بھی چھوڑ دیتے ہیں جب آپ نے ان کی نصرت اور حمایت کا عہد کیا ہو، لیکن عملی میدان میں آپ کی طرف سے نہ مؤثر اقدام دکھائی دے، نہ قابلِ ذکر مدد؛ صرف تقریریں، تجزیے، دعوے اور نمائشی سرگرمیاں باقی رہ جائیں۔

4۔ جب مکمل تیاری کے انتظار میں مدد ہی مؤخر کر دی جائے:

آپ ان کا ساتھ اس وقت چھوڑ دیتے ہیں جب اپنی کمزوری، تاخیر اور محدود صلاحیت کو جاننے کے باوجود فوری طور پر دستیاب وسائل کو حرکت میں نہیں لاتے۔

میدان ہمیشہ اس بات کا انتظار نہیں کرتا کہ آپ کی تمام تیاریاں مکمل ہوں، تمام منصوبے بہترین شکل اختیار کر لیں اور آپ اپنی پوری قوت جمع کر لیں۔ اگر پوری قوت ممکن نہیں تو جتنی استطاعت ہے، اتنی ہی سے آغاز کیجیے؛ نصف قوت سے، ایک چوتھائی سے، حتیٰ کہ دسویں حصے سے۔ عملی قدم، کامل منصوبے سے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے۔

5۔ جب ضرورت کہیں اور ہو اور آپ کی توانائی کہیں اور صرف ہو:

اگر آپ جانتے ہیں کہ اس وقت اہلِ مصیبت کو کس چیز کی فوری ضرورت ہے، مگر اپنی توانائی ایسے میدان میں صرف کرتے ہیں جس کی انہیں فی الحال ضرورت نہیں، تو یہ بھی

ایک طرح کا خذلان ہے۔

ضرورت کا صحیح تعین اور وسائل کا درست رخ ہی حقیقی نصرت ہے۔

6۔ جب فوری بحران کے دوران صرف مستقبل کے منصوبوں میں الجھ جائیں:

طویل المدت منصوبے اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن جب لوگ روزانہ مر رہے ہوں، گھر تباہ ہو رہے ہوں اور زندگی کا بنیادی ڈھانچہ برباد ہو رہا ہو تو ایسی سرگرمیوں کو ترجیح دینا جن کے نتائج کئی سال بعد ظاہر ہوں، موجودہ ذمہ داری سے فرار بن سکتا ہے۔

جو آگ آج لگی ہے، اسے آج ہی بجھانے کی کوشش ضروری ہے۔

7۔ جب حقیقی اثر کے بغیر نمائشی سرگرمیوں میں مصروف ہو جائیں:

آپ ان کا ساتھ اس وقت بھی چھوڑ دیتے ہیں جب آپ ایسی تقریبات، سرگرمیوں اور اقدامات میں مشغول ہو جائیں جن کے بارے میں آپ پہلے ہی جانتے ہیں کہ وہ محض رسمی کارروائیاں ہیں، زمینی حقیقت پر ان کا کوئی خاص اثر نہیں اور نہ ہی وہ ظلم کی شدت کو کم کرنے میں کوئی حقیقی کردار ادا کرتی ہیں۔

مظلوموں کو صرف تصویروں اور نعروں سے زیادہ کی ضرورت ہوتی ہے؛ انہیں ایسا عمل چاہیے جو حقیقت کو بدلنے میں حصہ ڈالے۔

8۔ جب آپ اپنی پالیسیوں کی حدیں بدلنے سے انکار کر دیں:

اگر آپ نے خود کو ایسی مصلحت پسندانہ پالیسیوں کا پابند کر رکھا ہے جو آپ کے عمل کو محدود کرتی ہیں، تو بحران کے وقت ان حدود پر نظرِ ثانی ضروری ہے۔

ظلم کے مقابلے میں موقف کی بلندی، اگرچہ اس کی کچھ قیمت ادا کرنا پڑے، کبھی کبھی اجتماعی دباؤ پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ جب مختلف قوتیں اپنی اخلاقی اور سیاسی حدود بلند کرتی ہیں تو ان حکومتوں پر بھی دباؤ بڑھتا ہے جو بظاہر ہمدردی کا اظہار کرتی ہیں لیکن عملی طور پر ظلم کے خلاف مؤثر قدم نہیں اٹھاتیں۔

9۔ جب معمول کی مصلحتیں ظلم کے ساتھ تعلقات پر غالب آ جائیں:

اگر آپ کسی ایسے تعلق، مصلحت یا مفاہمت کا حصہ ہیں جس سے ظالم کو فائدہ پہنچتا ہے، تو کم از کم اتنا ضرور کیجیے کہ اپنی استطاعت کے مطابق اس صورتحال کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔

اپنے معاشرے کو ظلم کے براہِ راست یا بالواسطہ اثرات سے پاک رکھنے کی کوشش بھی نصرت کی ایک صورت ہے۔

10۔ جب مظلوم کی تکلیف کو ذاتی یا سیاسی مفاد کا ذریعہ بنا لیں:

آپ ان کا ساتھ اس وقت بھی چھوڑ دیتے ہیں جب ان کی تکلیف کو سیاسی مقبولیت، جماعتی مفاد، ذاتی شہرت یا مالی منفعت کے لیے استعمال کرتے ہیں، مگر آپ کے اقدامات کا کوئی حقیقی تعلق اس مقام سے نہیں ہوتا جہاں درد موجود ہے۔

مظلوم کی آہ کو اپنی تشہیر کا ذریعہ بنانا اور اس کے درد کو عملی ذمہ داری سے جدا کر دینا اخلاقی دیانت کے خلاف ہے۔

11۔ جب اپنی ناکامی تسلیم کرنے کے بجائے خاموش رہیں:

اگر آپ مدد کرنے میں ناکام رہے ہیں تو کم از کم اپنی ناکامی کو تسلیم کیجیے، اپنی ذمہ داری واضح کیجیے اور دوسروں کو وہ راستہ اختیار کرنے کی دعوت دیجیے جس پر آپ خود آگے نہیں بڑھ سکے۔

اگر آپ کسی ذمہ داری کے امین ہیں اور اسے ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تو اسے ایسے شخص کے سپرد کرنا زیادہ دیانت دارانہ ہے جو اسے ادا کر سکے۔

12۔ جب اپنے ساتھ موجود لوگوں کو بھی متحرک نہ کریں:

آپ کی ذمہ داری صرف خود کچھ کرنے تک محدود نہیں۔ اگر آپ کے پاس لوگوں کو متحرک کرنے، انہیں کسی مؤثر اور جائز طریقے سے مدد کے لیے آمادہ کرنے اور ظلم کے خلاف اجتماعی آواز پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، تو اسے استعمال نہ کرنا بھی ایک کوتاہی ہے۔

13۔ جب مؤثر اور جائز اقدام کا راستہ موجود ہو، مگر آپ خاموش رہیں:

اگر آپ کے پاس ایسا جائز اور مؤثر راستہ موجود ہے جس کے ذریعے آپ ظالم پر دباؤ ڈال سکتے ہیں، مظلوم کی مدد کر سکتے ہیں یا ظلم کے نظام کے خلاف مؤثر آواز بن سکتے ہیں، مگر آپ محض سہل پسندی یا خوف کی وجہ سے کچھ نہیں کرتے، تو آپ اپنی استطاعت کے ایک اہم حصے کو ضائع کر رہے ہیں۔

14۔ ہر گزرتا ہوا لمحہ ذمہ داری کو بڑھاتا ہے:

بحران کے میدان میں وقت غیر جانب دار نہیں ہوتا۔ ہر گزرتا ہوا گھنٹہ کسی کے لیے مزید نقصان، مزید تباہی اور مزید انسانی قیمت کا سبب بن سکتا ہے۔

طویل انتظار کے بعد بھی اگر ہم صرف یہ کہتے رہیں کہ ''ابھی وقت نہیں آیا''، تو ہمیں اپنے ضمیر سے یہ سوال ضرور کرنا چاہیے کہ آخر وہ وقت کب آئے گا جب ہماری ذمہ داری ہمیں عمل پر مجبور کرے گی؟

15۔ مسلسل بے عملی کا انجام:

اگر انسان اپنی پرانی عادات، سہل پسندی، مصلحتوں اور بے اثر سرگرمیوں میں گرفتار رہتا ہے اور ان بھائیوں کو تنہا چھوڑ دیتا ہے جو شدید آزمائش سے گزر رہے ہیں، تو اسے اس خطرے سے غافل نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین اور اپنے مظلوم بندوں کی مدد کے لیے کسی اور قوم کو کھڑا کر سکتا ہے۔

قرآن کا انتباہ واضح ہے:

إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

''اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا، اور تم اسے کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

یہ صرف دوسروں کے لیے سوال نہیں، ہمارے اپنے لیے بھی ایک آئینہ ہے۔

ہمیں خود سے پوچھنا چاہیے:

کیا ہم واقعی مظلوموں کے ساتھ کھڑے ہیں؟

کیا ہماری آواز، ہمارا وقت، ہماری صلاحیت، ہمارے وسائل اور ہماری ترجیحات ان کے درد سے جڑی ہوئی ہیں؟

یا ہم نے حمایت کو محض الفاظ، تقریبات، تصاویر اور بیانات تک محدود کر دیا ہے؟

مظلوموں کی نصرت صرف یہ نہیں کہ ہم ان کے لیے افسوس کا اظہار کریں؛ نصرت یہ ہے کہ ہم اپنی استطاعت کے دائرے میں حقیقی، مؤثر اور مسلسل کردار ادا کریں۔

اس لیے خبردار رہیے کہ تاریخ اور اپنے رب کے سامنے ہمارا نام ان لوگوں میں نہ لکھا جائے جنھوں نے آزمائش کے سب سے کڑے وقت میں اپنے بھائیوں کو تنہا چھوڑ دیا۔

یاد رکھیے: اللہ اہلِ حق کا ولی ہے، اور وہ اپنی مدد کے لیے انہی بندوں کو منتخب کرتا ہے جو اخلاص، ہمت اور عمل کے ساتھ اس کے دین اور مظلوموں کا ساتھ دیتے ہیں۔

صورت حال: مرزا محمد الیاس

نازی جرمنی اور نسل پرست اسرائیل پالیسیاں

جرمنی کی ایک علاقائی عدالت نے قرار دیا ہے کہ اسرائیل کے غزہ میں فلسطینیوں کے خلاف جنگی اقدامات اور نازی جرمنی کے یہودیوں کے خلاف کارروائیوں میں گہری مماثلت قرار دیا ہے۔ ایک عورت کو سوشل میڈیا پر اسرائیل کے اقدامات کو نازی جرمنی جیسے اقدامات قرار دینے کے لیے پوسٹ کرنے پر قید کی سزا دی تھی۔ اب ایک علاقائی عدالت نے اس فیصلے کو غلط قرار دیا ہے اور سزا یافتہ عورت کے مؤقف کو درست تسلیم کرلیا ہے۔

حالیہ برسوں میں جرمنی نے اپنی اسرائیل پالیسیوں کو ازسرنو طے کرتے ہوئے پولیس کو اختیار دیے تھے اور فلسطین کے لیے احتجاج کرنے والوں کو گرفتار کرنا شروع کردیا تھا۔ ان کے خلاف انتظامی فیصلے کیے تھے اور مجرمانہ سرگرمیوں میں شامل ہونے کے مقدمات درج کیے تھے۔

7 اکتوبر 2023ء کے بعد جرمنی نے حماس پر پابندی لگادی تھی۔ اس کے علاوہ فلسطین کے ایڈووکیسی گروپ سیمی ڈاؤن (Samidown) کو بھی کام سے روک دیا گیا تھا۔ جرمنی نے نازی ازم کے احیاء کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے بعض مقامی تنظیموں کو بھی خلاف قانون قرار دے دیا تھا۔

جرمنی کی عدالت کا حالیہ فیصلہ تب آیا جب ایک عورت نے اسرائیل کی نسل کشی (Genocide) کی مہم کو واضح کرنے کے لیے نازی جرمنی کی علامات اور نازی ازم کے خاکے سوشل میڈیا پر پوسٹ کیے تھے۔ اس رولنگ کو تحفظ شدہ سیاسی اظہار کی خلاف ورزی قرار دیا گیا اور اس سزا یافتہ عورت کو بری کردیا تھا۔ یاد رہے کہ ان خاکوں اور علامات کی سوشل میڈیا پر اشاعت جرمنی کے بعض حلقوں نے سیاسی اعتبار سے مجرمانہ فعل قرار دیا تھا۔
جرمنی میں جاری اس سیاسی بحث کو سامنے رکھتے ہوئے اس عورت کی طرف سے جاری نازی خاکوں اور علامتوں کو مجرمانہ قرار دیا گیا تھا۔ ان علامتوں اور خاکوں کی مماثلت اسرائیل کے غزہ میں نسل کش اقدامات سے ملائی گئی تھی۔ اسی دوران میں انٹرنیشنل کریمنل کورٹ نے اسرائیل کے بڑے سیاسی و فوجی راہنماؤں کو انسانیت کے خلاف جنگی جرائم کا مرتکب قرار دیا تھا۔ یہ مقدمات ابھی کورٹ میں تھے کہ جرمنی کے عوام کی رائے تقسیم ہوگئی تھی۔ کئی جرمن سیاسی پارٹیاں اور تنظیمات اسرائیل کے اقدامات کے خلاف تھیں اور دیگر حق میں تھیں۔

7 اکتوبر کے مبینہ واقعات سے پہلے بھی اسرائیل کے بارے میں ایک بحث جرمنی میں ہو رہی تھی، جرمن پول سروے بتا رہے تھے کہ جرمنی میں ایک سوچ بڑی تیزی سے مضبوط ہو رہی ہے کہ نازی جرمنی نے جو اقدامات یہودیوں کے خلاف کیے تھے، اسرائیل کے فلسطینیوں کے خلاف اقدامات بالکل ویسے ہی ہیں۔ پھر ایک مرحلہ ایسا آیا جب جرمن شہریوں کی 60 فیصد تعداد نے اسرائیل کے غزہ میں جنگی حملوں کو نازی جرمنی کے اقدامات سے بھی زیادہ تشدد اور قتل وغارت زدہ قرار دیا تھا۔

اخلاقی معاملات:

جرمنی کے ماضی میں نازی کردار اور غزہ میں اسرائیل کے حملوں پر بحث کا آغاز علمی، فلسفیانہ اور قانونی دائروں میں ہوا تھا۔ اس بارے میں جرمنی میں اس سطح اور نوعیت کے واقعات پر بحث ومباحثہ جاری تھا۔ ان میں فلسطینیوں کے خلاف اقدامات کو بہیمانہ قرار دیا جاتا رہا۔ یہ سلسلہ 1948ء سے ہی شروع ہوگیا تھا۔ غزہ کی ناکہ بندی نے اس سلسلے میں مباحث میں سخت رائے پیدا کردی تھی اور اس امر پر تقریباً اتفاق رائے پیدا ہوگیا تھا کہ اسرائیل مقامی فلسطینی آبادی کو اپنا ناجائز قبضہ مستحکم بنانے کے لیے ختم کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اقدامات کررہا ہے۔

جرمنی کی قومی یادداشت میں یہ بات پختہ جگہ بنا رہی تھی کہ اسرائیل اور نازی جرمنی دراصل ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ یہ ایک انتہا درجے کی مماثلت تھی جو بہت سے مؤثر جرمن حلقوں میں جگہ بنا رہی تھی۔ اسے جرمنی میں شعاع (Shoah) کہا جانے لگا تھا جونکبہ کے ہم معانی تراکیب یا اصطلاحات تھیں۔ ان دونوں کے مطالب ''تباہی، اور قیامت'' کے لیے جاتے تھے۔ ایموس گولڈ برگ جیسے جرمن سکالر یا بشر دونوں کو باہم یکجا معاملات قرار دے رہے تھے۔

ان سکالرز نے جرمنی میں ایک بحث اور شروع کی جس میں کہا جانے لگا کہ یہ ایک ایسی تاریخی ذمہ داری ہے، وراثت میں ملا جرم ہے اور خصوصاً یہ ایک قیامت اور تباہی کی یاد

دلاتا ہے اور دونوں کی وضاحت اور تشریح بھی ایک جیسی ہے۔
یہ بحث عصر حاضر کے جرمنی میں بھی دونوں جرائم یعنی شعاح اور نکبہ کو ایک سا قرار دیتی آرہی ہے جرمنی کے علمی حلقوں میں یہودی یادداشت کو 2023ء میں ماشا گیسن نے غزہ کے واقعات سے جوڑا تھا۔ اس ساری بحث سے یہ حقیقت آشکار ہو رہی تھی کہ یہودی یادداشت پر جرمن حکومت کو کس قدر اتھارٹی حاصل ہے یا دی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس فلسطینی تکالیف کو زیادہ محسوس کیا جانے لگا تھا۔
پہلے انتفادہ کے دوران میں بعض اسرائیلی فوجیوں نے اپنی شناخت نازی فوجیوں کے مماثل قرار دی تھی۔ دوسری طرف پوری دنیا کی طرح جرمن عوام بھی فلسطینیوں کے خلاف اقدامات اور کارروائیوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسی لیے ایک سکالر نے باقاعدہ اس مماثلث پر پوری کتاب لکھی جس میں 1987ء سے لے کر 1993ء تک کے مظالم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔
اس کتاب میں انہوں نے لکھا: I Felt Flute Bikes Nazi
یہ کتاب بالکل ویسے حالات بیان کرتی ہے جس طرح کی دنیا نازیوں کے بارے میں سوچتی ہے اور ان کے سامنے یہودی تھے۔ چناں چہ بین الاقوامی جرائم کی عدالت نے بھی اسے اپنے تبصرے کا حصہ بنایا اور لکھا کہ قومی شناخت اور تاریخی یادداشت کے لیے فلسطینی حقوق بہت اہم ہیں۔
گزشتہ دس برسوں میں جرمنی میں اسرائیل کی سلامتی یقینی بنانے کے بارے میں سرکاری سطح پر سوچ اور عمل دونوں گہرے ہونے تھے۔ اس طرح داخلی سیاست میں اسرائیل کے لیے ایک وسیع تر فریم ورک بنایا گیا۔
اگرچہ ''ریاست کی وجوہات'' کوئی آزاد قانونی قوت نہیں رہی۔ اس سے فیصلہ سازی میں اس رجحان میں اضافہ ہوا جس نے وزارتوں، یونیورسٹیوں، میونسپل اداروں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں میں جگہ پائی گویا ''ہولوکاسٹ'' کا نعرہ اپنا کام دکھا رہا تھا لیکن بین الاقوامی عدالت کے حالیہ فیصلے نے واضح کر دیا تھا کہ ایسی سیاسی عہد سازی دستوری معیارات کی جگہ نہیں لے سکتی بالخصوص جب سیاسی خطابت اور قانونی برتری کا سوال سامنے ہو۔
حکومتیں اپنے مخصوص خارجہ پالیسی اقدامات اور مقاصد پر قدرے کھل کر کام کرسکتی ہیں لیکن عدالتیں قانون کے اندر رہتے ہوئے ہی کام کرسکتی ہیں۔ ان کا دائرہ کار سیاسی انداز اختیار نہیں کرسکتا۔ چناں چہ فیصلہ واضح طور پر جرمن ریاست کے جواز کے خلاف نہیں جاسکتا۔ اس کتاب میں انہوں نے اس کتاب میں انہوں نے لکھا: I felt Like a Nazi یہ کتاب بالکل ویسے حالات بیان کرتی ہے کہ جس طرح کی دنیا نازیوں کے بارے میں سوچتی ہے اور ان کے سامنے یہودی تھے۔ چناں چہ بین الاقوامی جرائم کی عدالت نے بھی اسے اپنے تبصرے کا حصہ بنایا اور لکھا کہ قومی شناخت اور تاریخی یادداشت کے لیے فلسطینی حقوق بہت اہم ہیں۔
گزشتہ 55 برسوں میں جرمنی میں اسرائیل کی سلامتی یقینی بنانے کے بارے میں سرکاری سطح پر سوچ اور عمل دونوں گہرے ہونے تھے۔ اس طرح داخلی سیاست میں اسرائیل کے لیے ایک وسیع تر فریم ورک بنایا گیا۔
اگرچہ ''ریاست کی وجوہات'' کوئی آزاد قانونی قوت نہیں رہی۔ اس سے فیصلہ سازی میں اس رجحان میں اضافہ ہوا جس نے وزارتوں، یونیورسٹیوں، میونسپل اداروں اور قانون نابذ کرنے والے اداروں میں جگہ پائی گویا ''ہولوکاسٹ'' کا نعرہ اپنا کام دکھا رہا تھا لیکن بین الاقوامی عدالت کے حالیہ فیصلے نے واضح کر دیا تھا کہ ایسی سیاسی عہد سازی دستوری معیارات کی جگہ نہیں لے سکتی بالخصوص جب سیاسی خطابت اور قانونی برتری کا سوال سامنے ہو۔ حکومتیں اپنے مخصوص خارجہ پالیسی اقدامات اور مقاصد پر قدرے کھل کر کام کرسکتی ہیں لیکن عدالتیں قانون کے اندر رہتے ہوئے ہی کام کرسکتی ہیں، ان کا دائرہ کار سیاسی انداز اختیار نہیں کرسکتا۔ چناں چہ فیصلہ واضح طور پر جرمن ریاست کے جواز کے خلاف نہیں جاسکتا۔

وسیع تر تبدیلی:

جرمنی کے نازی دور کو سامنے رکھا جائے تو قانون ساز اداروں اور افراد کے ساتھ ساتھ عدالتی نظام اقلیتوں پر مقدمات چلانے میں زیادہ حمایت حاصل کرتا ہے۔ آج کل جج صاحبان اسے اپنی اخلاقی ذمہ داری خیال کرنے لگے ہیں کہ وہ حکومت کے نظریاتی تشخص کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ سازی کو قابل توجہ نہیں سمجھتے۔ اسرائیل سے متعلقہ مقدمات اور امور میں وہ اپنی ذمہ داری کے احساس کے تحت فیصلے کرتے ہیں۔ وہ فلسطینیوں کی نسلی صفائی کی مہم کو Genocide طرز کے معاملات کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔ جنوبی لبنان میں اسرائیلی کارروائیوں کے بارے میں بھی ان کا رویہ اسی طرح کا ہی ہے۔
پہلی انتفادہ کے دوران میں بھی کسی کو آزادیٔ اظہار حاصل نہیں رہی۔ آج بھی جرمنی کا دیگر ممالک سے تقابلی جائزہ لیا جائے تو ایک وسیع تر تبدیلی دیکھی جا رہی ہے۔ یہ تبدیلی جرمنی کے اندر جرائم کی تفتیش اور کارروائیوں میں دیکھی جا رہی ہے۔ اس میں فلسطینی جدوجہد ایک علامتی کردار سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ اس سے قومی شناخت اور تاریخی ذمہ داری کا تعلق بھی اسی طرح سے علامتی سا ہے۔
اس سلسلے میں ہونے والے مباحث زیادہ تر ایک ہی کردار یا علامت سے جڑے ہیں۔ اس کے بجائے ایک میکانزم ابھرا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرمنی جنگ کے بعد ایک نیا تشخص پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔
ان حوالوں سے عدالتوں کا بھی نیا کردار سامنے آرہا ہے۔ اس میں عدالت اب ایسی جگہ ہے جہاں تاریخ، ایڈووکیسی اور ریاستی قانونی پوزیشن کی نئی تعبیرات کی جا رہی ہیں۔
جس عورت کو نازی جرمنی کی علامتوں کو سوشل میڈیا پر دکھانے پر فیصلہ دیا گیا، اس سے لامحدود طور پر یہ حق سلب نہیں ہوا جو حکومتی رائے کے خلاف جانے والوں کو متاثر کرسکے۔ اور نہ ہی ہولوکاسٹ کے بارے میں جرمن قوانین ہی تبدیل ہوتے ہیں۔ ہولوکاسٹ پر اکسانے یا اس کے بارے میں بات کرنے کے امور پر عدالتی سوچ بھی پرانی ہے۔ اس کے بجائے اب سوچ یہ ہے کہ جرمنی کے جرائم سے متعلقہ فیصلے سیاسی اتفاق رائے پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں ہیں۔
دستوری حقوق اب بھی سیاسی اظہار رائے تک ہی محدود ہیں۔ ان میں ایسے حقوق میں صوابدید موجود ہے جن کے بارے حکومت کی پالیسی تبدیل ہو یا نہ ہو۔ یہ بات اب بھی غیر یقینی ہے کہ یہ رولنگ کسی بڑی دستوری یا عدالتی تبدیلی کا سبب بنی ہو، سیاسی کارکنوں کھل کر بات کرنے دی جا رہی ہو۔ تاہم صحافیوں اور سکالرز کو قدرے آزادی ہے کہ وہ فلسطین پر کھل کر بات کرسکتے ہیں۔ اگر جرمنی کی اپنی عدالتی تاریخ کو مدنظر رکھا جائے تو اس میں ایسی پے چیدگی بہرحال اب بھی موجود ہے۔ ججوں کی یہ خصوصی دستوری ذمہ داری خیال کی جاتی ہے کہ وہ سیاسی وعدوں کا پاس رکھیں لیکن وہ کسی صورت میں بنیادی حقوق کے خلاف کوئی رولنگ نہیں دے سکتے۔

پسِ منظر: ابوالعین

غزہ میں اسرائیلی جارحیت ناکام رہی، اب بھی کامیاب نہ ہوگی

یہ دنیا بھی مفادات کے ہاتھوں عجیب جگہ ہے۔ ایک طرف ''غزہ کی فتح'' کا اعلان ہو رہا ہے، دوسری طرف اسی مقام سے ''21 لاکھ انسانوں'' کو ان کے گھر بار سے بے دخل کرنے کا پروگرام بنایا جا رہا ہے۔ اس کام کو کمال ڈھٹائی سے کیا جا رہا ہے۔ اس میں شرم و حیاء کا کوئی کردار نہیں ہوگا۔ دوبارہ غزہ کی خالی جگہ قابض لوگوں کو دی جائے گی۔ ان مقاصد کے تحت جن کی نظریاتی وجوہات کا اسرائیل کو بھی علم نہیں جو غزہ کا خود ساختہ محافظ بننے جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اکیسویں صدی کا پہلا نوآبادیاتی تسلسل ہوگا۔ یہ ظاہر یہ نوآباد کاری کی تحریک کہلائے گی۔ یہ تحریک خود اپنی بنیادوں اور جڑوں کی تلاش میں ہے۔ حتیٰ کہ اس کے لیڈران وہی ہیں جو پارک ہوٹل کی تاریخ سے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے الخلیل (ہیبرون) میں یہودی (نو) آباد کاری کی تھی۔ انہوں نے یہ مرحلہ نصف صدی پہلے مکمل کیا تھا۔ انہوں نے ہی سماریہ میں کش امونیم کے ذریعے وہ چوکیاں قائم کی تھیں جہاں وزیر خزانہ بزازیل سموٹریش کی پرورش ہوئی۔ یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا۔ یہی وہ دن تھا جب اکتوبر 1973ء کی جنگ کا آغاز ہوا تھا۔

اکتوبر 2023ء میں فلسطینیوں کے (نام نہاد) حملے نے غزہ پر بھاری تعداد میں اموات اور تباہی کے راستے کھول دیے تھے۔

یہ ''خونیں تاریخ''، فلسطین کی تاریخ میں کئی طرح سے منفرد تھی۔ یہ ایسی تاریخ ثابت ہوئی جس نے فلسطین پر ''لبرل قبضے'' کے پرخچے تک اڑا دیے تھے۔

یہ سب کچھ 1967ء کے بعد اسرائیل کی بیان کردہ پالیسیوں کی بھی نفی تھی اور یہ سب ناقابل قبول مرحلے کا تباہ کن آغاز تھا۔ ریمونڈ احوا الطویل نے ایک مرتبہ (راقم) جیریمی ایرونسن کو کمال راز داری سے غزہ ریسٹورنٹ میں دوسری انتفادہ کے تاریک دنوں میں بیس سال قبل آگاہ کیا تھا کہ غرب اردن پر مسلط کی جانے والی تباہی غزہ میں دھرائی جائے گی۔ یہ قبضہ کے سنہری ایام سمجھے جاتے تھے۔

یہ اسرائیل کی طے شدہ حکمت عملی تھی جس کے تحت وہ مقبوضہ عرب علاقوں میں اپنے تزویراتی اہداف حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ ان علاقوں میں اپنا اقتدار بلاخوف و خطر جاری رکھے اور اس حکمرانی کو مستحکم کر سکے۔ اسے کسی مسابقت کا خطرہ درپیش نہ ہو۔

موشے دایان کی ایسی ہدایات تھیں جس کے تحت اسرائیل ایک لبرل قبضے کو جنگ کے بعد برسوں میں اختیار کرے اور یوں اپنے ملکی استحکام کی جانب گامزن رہے۔ اس میں اسرائیل میں فلسطینیوں کے بے لگام داخلے کو روکنا، اردن سے ہر موسم سرما میں مغربی کنارے میں داخل ہونا یا گھس آنا، تل ابیب اور بیت المقدس کو کھلے شہر قرار دینا، کسی بھی صورت کسی فلسطینی کو کسی کراسنگ سے اسرائیل داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے اسرائیل اور مقبوضہ عرب علاقوں میں فوجی کراسنگ تعمیر کی جائیں، ایسے عارضی ممبر شپ کارڈ جاری کیے جائیں (جو کسی بھی وقت اور غیر مشروط طور پر منسوخ کیے جا سکیں، یہ ممبر شپ کارڈ یروشلم سے نو تعمیر شدہ اسرائیلی کسی بھی شہر میں داخلے کے لیے استعمال نہ ہوں اور نہ کرنے دیے جائیں، نو مینز لینڈ (No man's Lahnd) میں کسی کو رکنے نہ دیا جائے۔ یہ کارڈ دمشق گیٹ سے بیرزیت BirZiet یا نابلس آنے جانے کے لیے

ہوں، موشے دایان نے مزید لکھا کہ جب میں ایک نوجوان طالب علم تھا تو برزیت یا نابلس سے دمشق گیٹ آیا کرتا تھا۔ اس میں مجھے کسی نوعیت کی رکاوٹ پیش نہیں آتی تھی۔ اب ایسے ٹرپس (Trips) عرصہ ہوا ناممکن ہو چکے ہیں۔ حتیٰ کہ جب 1982ء میں لبنان پر اسرائیل نے جنگ مسلط کی، وزیر دفاع ایریل شیرون نے دو ایسے سپاہیوں کو ہٹا دیا جو دوران ڈیوٹی سوئے پائے گئے جب کہ ان کے ذمے تھا کہ وہ مین روڈ کے راستے کی نگرانی کریں اور کوئی اسرائیل سے غزہ کی پٹی کا سفر نہ کر سکے۔ یہ ہفتہ غزہ غزہ اسرائیلیوں سے سے بھرا ہوتا، وہ ساحل سمندر پر اشیائے خورد و نوش کھا پی رہے ہوتے تھے۔ مچھلی پیش کرنے والے ریسٹورنٹ کھلے ہوتے اور ان کی کاروں کی مرمت کا کام غزہ جانے والی سڑک کنارے ہو رہا ہوتا تھا۔

ایک بڑی یہودی بستی کی تعمیر کا کام اپنے ابتدائی مراحل میں تھا۔ اسرائیل کی ہائی کورٹ اطمینان کر بیٹھی تھی کہ وہ یہودی بستیاں غزہ میں عارضی انتظام تھا۔ تب یہودی آبادکار وہاں قابل رحم حالت اور اقلیت میں تھے۔

جب اسرائیل کے یہودی آبادکاروں کی آبادی 50 ہزار تھی اور اس میں سے 10 ہزار مغربی کنارے میں تھے، تب مناہم بیگن نے ایک ہلکا سا اشارہ دیا تھا کہ اسرائیل یہ تزویراتی نیت رکھتا ہے جب اس نے وہاں کے لوگوں کو خودمختاری دینے لیکن زمین سے محروم رکھنے کا کہا تھا جب ایسی مختصر ''خودمختاری'' کے مذاکرات ہو رہے تھے۔

زمین تو وہ کرنسی تھی جس کے لیے نوآبادکار یہودی تجارت کر رہے تھے۔ ان کے لیے اسرائیل تو سارا ان کا تھا اور غزہ ایک بکری یا دونم تھا۔ 1980 کے قریب یہودی آبادکاروں کی آبادی ایک لاکھ ہو چکی تھی۔ ان کے لیے انفراسٹرکچر مسلسل تعمیر کے مراحل طے کر رہا تھا۔ اس کے لیے 1973ء بیگن کو اقتدار سے نکال دیا گیا تھا۔

پہلی انتفادہ، اب تباہ حال، جبالیہ سے شروع ہوئی تھی، اس کا آغاز دسمبر 1987ء میں ہوا تھا۔ انتفادہ نے ہمیشہ کے لیے ایک دوستانہ تصفیے کا تصور بالکل ختم کر دیا تھا۔ آئزک رابن کا نظریہ غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ان کی ہڈیاں توڑنا ہی کافی ہے۔ لیکن سچائی سے فرار تھا۔ یہ قبضے اور آبادکاری کی روح کے ہی خلاف تھا۔ رابن کا خیال تھا کہ مغربی کنارے کو ہر طرح سے یہودی بستیوں سے بھر دیا جائے۔ اس سے کوئی قیمت ادا کیے بغیر فلسطینیوں کو ذاتی اور قومی وجود سے محروم کر دیا جائے گا۔ بیک وقت اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا تھا۔ لیکن یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔

یہودی آبادکاروں اور ان کی یہودی بستیاں تعمیر و توسیع کرنے کی تحریک فلسطینیوں کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ اس میں بھی خیال یہی کارفرما تھا کہ آرمی اور سیاستدانوں کو جارحانہ انکسار سے باور کرایا جائے جسے آج بہت متحرک طور پر یہودی آبادکاری کی جائے اور فلسطینیوں کو ان کی املاک اور آبادیوں سے نکال باہر کیا جائے۔ یہ کام مغربی کنارے اور مقبوضہ مشرقی بیت المقدس میں زیادہ تیزی سے کیا جائے۔

اوسلو معاہدے نے اس کام کو سپر انداز میں آگے بڑھانے میں بڑی مدد دی۔ 1993ء میں نوآبادکاروں کی تعداد 120,000 تھی۔ یہ مغربی کنارے میں آباد کیے گئے اور اتنی ہی تعداد مقبوضہ مشرقی بیت المقدس میں آباد کی گئی۔ اب یہ تعداد 5 لاکھ اور نئی آبادکاری سے مزید 230,000 سے تجاوز کر گئی تھی۔

ہمیشہ کی طرح آبادکاری کا سلسلہ کبھی بھی روکا نہ گیا۔ اس کے ساتھ انتظامی ڈھانچہ اور سیکیورٹی سٹرکچر مضبوط تر ہوتا گیا۔ پھر جیسا کہ اب کی صورت حال ہے، یہ اسرائیلی ارادوں کا بہترین بیرومیٹر بھی ثابت ہوا۔ آبادکاری اس وقت بھی اور اب بھی نئی حقیقت پیدا کرنے کا سبب بنتی گئی۔ اب سفارت کاری کے لیے کوئی راستہ نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ اس نئی حقیقت کو تسلیم کر لے۔

امریکہ کی قیادت میں امن کا عمل آبادکاری کا کسی بھی طرح مساوی نہ رہا تھا۔ اس نے سب کچھ تبدیل کر کے رکھ دیا۔ آبادکاری اب بے روک ٹوک جاری تھی۔ مغربی کنارے میں تیزی سے بستیاں بن رہی تھیں اور نوآبادکار یہودی وہاں آ رہے تھے۔ اس کے بجائے ایریل شیرون نے وزیراعظم کے طور پر اور خصوصاً امریکہ سے وعدوں کے ساتھ ''چھینو اور آبادکاری کرو'' کے اصول پر چلتے ہوئے مغربی کنارے کی پہاڑی چوٹیوں سے یہودی نوآبادکاری شروع کی جو آج تک جاری ہے۔

دوسری انتفادہ کے تاریک ترین دنوں میں نابلس کے پناہ گزین کیمپ کے باہر کیروسین تیل کی پیلی روشنی کے گرد بیٹھے بلاٹہ پناہ گزین کیمپ کے قریب، الاقصیٰ مارٹائر بریگیڈ کے ایک نوجوان نے انتہائی رازداری سے تنظیم کی بقاء کا سوال اٹھایا۔ اس نے کہا کہ فلسطینی پولیس نوآبادکاروں کا سامنا کرے گی یا فوج سے الجھے گی، کسی کو دیہاتیوں کو تحفظ فراہم کرنا ہوگا تاکہ وہ نوآبادکاروں کے حملوں سے بچے رہ سکیں۔

دوسری انتفادہ نے اسرائیلی حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنا چاہا لیکن ناکام رہی۔ پی ایل او برائے نام مشروط خودمختاری تک ہی محدود کر دی گئی۔ اسے مغربی کنارے کے ایک نسبتاً محدود کر دی۔ یہ خودمختاری اسے مغربی کنارے کے ایک نسبتاً محدود بلاک میں دی گئی۔ شیرون نے اس دوران میں ایک حفاظتی انتظام کر لیا تھا جس نے یاسر عرفات کو مقاطعہ (رام

اللہ کا ہیڈ کوارٹر) تک محدود کر دیا تھا۔ اس دوران میں سلامتی کے جو امور طے ہوئے۔ وہ ایریا B،A اور C میں تاریخی معاہدہ کی صورت میں عمل میں لائے گئے۔ اس دوران میں اسرائیل کے تعلقات غزہ اور حماس کے ساتھ برتری کا تاثر لیے ہوئے تھے۔
پہلی فلسطینی جنگ کے دوران میں ایک موقع پر بن گوریان نے سوچا تھا کہ غزہ کو اسرائیل میں ضم کر دیا جائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہاں مہاجرین کو جمع ہونے سے روکا جائے۔ 1967ء کی جنگ کے بعد اسرائیل نے سمندر کی طرف سے غزہ کی پٹی کے بڑے حصے میں نو آباد کاروں کو 17 نو آباد کار بستیوں میں 7,500 کی تعداد میں بسا دیا تھا۔ یہ تعداد کبھی بھی اتنی بھی کافی نہیں تھی جو وہاں موجود فلسطینیوں کی غالب تعداد کا دباؤ برداشت کر سکتی۔
غزہ، خصوصاً پہلی خلیجی جنگ کے دوران میں تیزی سے بڑھتی خوفناک تحریک میں ہمیشہ اسرائیلی اقتدار کے لیے خطرہ رہی۔ یہاں فلسطینی مزاحمت بہت زیادہ تھی۔ آئزک رابن نے 1992ء میں وزارت عظمیٰ کی تحریک کی بنیاد یہ رکھی تھی کہ وہ غزہ کو تل ابیب سے نکال دے گا۔ یہ ایسا وعدہ تھا جو دس سال بعد ایریل شیرون نے پورا کرنے کی کوشش کی۔
شیرون کی غزہ سے دوری نے ہمیشہ کوشش کی کہ غزہ کو سیکیورٹی اور سفارتی پیراڈائم کے نئے حوالے میں رکھے۔ یہاں جنگ کے قانون سے کام لیا جائے اور اسرائیل کی قبضہ کی پالیسی سے دور رکھا جائے۔ غزہ کو مغربی کنارے سے الگ کر دیا جائے، پی ایل او/الفتح کو حماس سے الگ کر دیا جائے۔ غزہ کو مصر کے داخل میں دھکیل دیا جائے۔ اس کام کو امریکہ کی سپورٹ سے کیا جائے۔
اسرائیلی قابض فوج کو غزہ سے ہٹانے کے ذریعے شیرون چاہتا تھا کہ آباد کاری اور سلامتی کو ایک دوسرے سے الگ رکھا جائے۔ اس پالیسی نے اب تک اسرائیل کی تاریخ کو یرغمال بنائے رکھا جائے۔ اس نے بہت سے شا کی ارکان سے بحث بھی کی اور کہا کہ آباد کاری کے بناء آرمی اور اسرائیل دونوں محفوظ تر رہیں گے۔ جب اگلی جنگ کا وقت آیا، جیسا کہ وہ جانتا تھا کہ وہ جنگ ہوگی، اسرائیل کو یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ وہ جنگ کو اس کے اصولوں پر لڑے نہ کہ ایک قابض کے طور ایک قابض کے طور پر لڑے۔
اس معاملے میں شیرون بہت آگے نکل گیا تھا۔ وہ مزید آگے نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا اپنا وزیر دفاع اس سے بحث کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ غزہ سے الگ تھلگ رہنے کی پالیسی اس کے باوجود غزہ پر مؤثر کنٹرول رکھ سکتا تھا۔ اس طرح بین الاقوامی طور پر حاصل ذمہ داری ادا کر سکتا تھا۔ وہ حل یہ پیش کرتا تھا کہ جو سرحدیں تجارت کے لیے کھلی تھیں اور ان سے آمد و رفت جاری تھی، اسے ختم کر دیا جائے اور غزہ کو بیرونی دنیا کے لیے بند کر دیا جائے۔
جب 2006ء کا الیکشن حماس جیت گئی۔ اکتوبر 2023ء میں حماس کے ''غیر معمولی حملے'' نے اسرائیل کی بنیادیں ہلا دی تھیں، نیتن یاہو کی حکومت نے غیر معمولی جواب کے طور پر لیا تھا۔
بہت سے دوسرے راہنماؤں کی طرح برطانوی وزیر اعظم کیئر سٹارمر نے اسے خطرناک ناکامی کے طور پر لیا تھا۔ یہ غزہ کو امداد مفراہم کرنے میں ناکامی تھی۔ ''ہم نے بھوک سے بلکتے بچے دیکھے، بچوں لاشے دیکھے، جو بچ رہے کہ وہ بھوک و پیاس کی وجہ سے کھڑے بھی نہ ہو پاتے تھے۔
اسرائیلی اقتدار کے آغاز کے دنوں سے، قابض اسرائیل کے خلاف مزاحمت عروج پر جا پہنچی تھی۔ یہ مزاحمت غزہ کے مزاحمتی پناہ گزین کیمپوں میں بہت زیادہ تھی۔ یہاں ایریل شیرون نے سیکیورٹی شاہراہوں کو بلڈوز کر دیا تھا۔ یہ تباہی جبالیہ اور نصیرات کیمپوں میں بہت زیادہ تھی۔ یہ سلسلہ 1970ء کے عشرے سے بہت زیادہ رہا اور بوریج کیمپ بھی اس کی لپیٹ میں آیا تھا۔ مزاحمت کچلنے کے آپریشنز ایسے تھے جو ہر طرف تباہی ناقابل بیان واقعات میں ڈھل گئے۔ تھے۔ یہ سب کچھ اسرائیل بار بار کر چکا تھا۔
انتقام سے بھی کہیں بڑھ کر آج کی تباہی ایک بامقصدنیت کو ظاہر کرتی ہے۔ اسے سو سالہ تاریخ سے بھی بڑی تباہی کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ اسرائیل نے جس انداز سے جنگ مسلط کی، اس کا مقصد غزہ کے علاقوں کو تباہ کرنا اور حماس کو ختم کرنا تھا۔ یہ دہشت گردی کا بدترین استعمال تھا۔ اس کا دوسرا مقصد یہودیت (صہیونیت) کی بلاشرکت غیرے حکمرانی قائم کرنا تھا۔ جو تباہی اور اس کے اثرات میں کوئی مثال دنیا بھر میں نہ رکھتی تھی۔
ایف اے او کے جائزوں کے مطابق وہ فصلیں جو 75 فیصد زرعی زمین پر ہوا کرتی تھیں، وہ تباہ یا ختم ہو چکی تھیں۔ یہ تباہی 31 دسمبر 2024ء سے قبل مسلط کی جا چکی تھی۔ مزید برآں، نصف سے زیادہ گرین ہاؤسز اور 67 فیصد پانی کے کنویں تباہ کر دیے گئے تھے۔ لائیوسٹاک 96 فیصد ختم کر دیے گئے، پولٹری صرف ایک فیصد بچ سکی۔ ماہی گیری بھی مکمل خاتمے کے قریب تھی۔
ایک بڑے فلسطینی افسر کے مطابق غزہ مغربی کنارے کے ایریا A اور B سے بھی بدترین کر دیا گیا تھا۔ یہ تقسیم اوسلو معاہدے نے پیدا کی تھی۔
اس کے ساتھ ساتھ ایک نیا زون بعد از جنگ بنایا جا رہا ہے۔ یہ غزہ کی پٹی کے اندر ہے۔ یہ غزہ کے اب تک 70 فیصد رقبے پر محیط ہے۔ اسے اسرائیل کا ایگزیکٹو سیکیورٹی زون کہا جا رہا ہے۔ یہ سرحد کے متوازی ہے۔ اس میں مصر کے ساتھ ساتھ بلاڈلفیا کاریڈور کا نام دیا گیا ہے۔ آباد کاری اور کنٹرول جو 2005-1967ء کے عرصے میں کیا گیا، اب اس ییلو لائن میں اہم ترین حصہ غزہ کی آبادی کا شامل کر لیا گیا ہے۔ سرحد کے ساتھ ساتھ ساحل سمندر کا حصہ اس سے الگ کر دیا گیا ہے۔
اب اسرائیلی قابض فوج علاقے کو ''دہشت گردوں'' سے پاک کرنے کے لیے اقدامات کرے گی۔ اس کا مقصد وسیع تر غزہ پر قبضہ کرنا ہے۔ اسے اسرائیل کے سیکیورٹی علاقوں میں شامل کیا جائے گا۔ اس کی وضاحت اسرائیل کے وزیر دفاع اسرائیل کاتز نے بھی کی ہے۔
اگر ماضی دیباچہ ہے تو نو آباد کار یہودی اسرائیل کے اس سیکیورٹی زون میں آئیں گے۔ ماضی میں یہودی بستیوں کی تعمیر کی غیر معمولی کامیابی، نصف صدی کے عرصے میں، بستیوں کی تعمیر کی کامیابیوں میں کسی طرح کا نقصان نہیں محسوس کیا جا رہا۔ اب غزہ میں تازہ یہودی بستیاں بنیں گی۔ تاہم یہ امکان ممکن نظر نہیں آتا۔ بستیوں کی تعمیر سے یوں ظاہر ہو رہا ہے کہ ارادہ یہ ہے کہ رقبہ کی بنیادوں کو فلسطینی خودمختاری کے قابل نہ رہنے دیا جائے۔ یہ دریائے اردن کا مغرب کا علاقہ ہے۔
نصف صدی سے اس پالیسی کو پوری طرح چیلنج نہیں کیا جا سکا۔ آج اوسلو کے عہد میں عملی طور پر اس کی کوئی مزاحمت موجود نہیں ہے۔ آج اسرائیلیوں میں یہ خیال مضبوط ہو رہا ہے کہ اب ایک قابل عمل فلسطینی ریاست نہیں وجود میں آسکتی۔ کینیسٹ میں فلسطینی خودمختاری مغربی کنارے سے بھی ختم ہو چکی ہے۔ غزہ میں جنگ نے اس قومی اتفاق رائے کو مضبوط کیا ہے۔ اسرائیل کی پالیسی کے علی الرغم بین الاقوامی اتفاق رائے۔۔ خود مختار فلسطین کے قیام کے خلاف۔۔ نہیں بل کہ قومی وجود پر ہے۔ اس قسم کی پالیسیوں کی قیمت ہمیشہ زیادہ زیادہ رہی ہے۔ غزہ میں اب بھی جاری جنگ اسرائیل کے نسل کشی کے منصوبوں سے پوری نہیں ہوگی۔

دامن خیال: ابوالعین

غزہ میں تین امریکی ڈاکٹروں نے کیا دیکھا؟

فلسطینیوں کی نسل کشی: انسانیت کی خودکشی

ایک نئی ڈاکومنٹری میں تین ڈاکٹروں نے ان مشکل حالات کا ذکر کیا ہے جن کا وہ تین سال سے زیادہ عرصے سے سامنا کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے محدود طبی سامان، اسرائیلی بمباری اور اپنے گھروں کو واپسی کا احوال بیان کیا ہے۔ واپسی پر انہیں میڈیا کے تعصب نے مزید پریشان کیا اور بالکل لاتعلقی ظاہر کی۔

فلسطینیوں کی نسل کشی (Genocide) کا مسلسل تیسرا سال تھا۔ اور اب بھی اس کے ختم ہونے کا دور دور تک امکان نظر نہیں آ رہا۔ تازہ ترین جنگ بندی اکتوبر 2025ء میں ہوئی تھی۔ اسرائیل نے غزہ پر بمباری جاری رکھی۔ وہ اس رپورٹ کے جاری ہونے تک مزید 200 فلسطینیوں کو شہید کر چکا ہے۔ ہنوز یہ ظلم جاری ہے۔

اس سے قبل اقوام متحدہ کے ماہرین اس ماہ کے آغاز میں رپورٹ کر چکے ہیں۔ اسرائیل کے وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو نے امریکی صدر ٹرمپ کا بورڈ آف پیس مسترد کر دیا ہے۔ اس نے حماس کے ساتھ ییلو لائن کے پرے اپنی افواج لے جانے سے بھی رضامندی ظاہر کرنے کے باوجود انکار کر دیا ہے۔ اس نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی فوج غزہ سے نکال لے گا۔ ''اس بوجھ نے طبی کام کو مکمل طور پر روک دیا ہے۔ آپ ہمارے ساتھیوں سے اس بارے میں روزانہ سن رہے ہیں۔ ان کے پاس وہ سامان ہی نہیں ہے جس سے وہ مریضوں کا علاج کر سکیں۔'' یہ باتیں ڈاکٹر طاہر احمد نے دی انٹرسپٹ بریفنگ میں کی ہیں۔ ''انہیں اس امر کی ہلکی سی بھی ضمانت نہیں دی جا رہی جو اسے انہیں سلامتی کا معمولی سا اشارہ بھی ملا ہو کہ وہ روائتی طبی طور پر اپنا کام جاری رکھ سکیں۔''

جس وقت یہ پوڈ کاسٹ (Pod Cast) ریکارڈ کیا جا رہا تھا، رپورٹر جونا والڈیز نے احمد سے گفتگو کی۔ وہ ایک ایمرجنسی میڈیسن فزیشن ہیں۔ وہ انسانی بنیادوں پر بھی کام کر رہے ہیں، وہ غزہ سمیت تصادم کے علاقوں میں طبی ریلیف فراہم کرتے ہیں۔ وہ (Poh Si Teng) کے ساتھ ڈائریکٹر بھی ہیں۔ ان کی زیر نگرانی ایک اور ڈاکومنٹری (American Doctors) منظر عام پر آئی ہے۔ یہ تین امریکی ڈاکٹروں کے بیانات پر مشتمل ہے۔ ان کا تعلق تین مختلف امریکی ریاستوں سے ہے۔ انہوں نے غزہ میں رضاکارانہ کام کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ وہ اپنی بہترین صلاحیت کے مطابق طبی امداد دینے کے لیے غزہ آئے تھے۔ زندگیاں بچانے کے لیے ان کے پاس بہت ہی محدود سامان اور ادویات تھیں۔ وہ سخت خطرے میں کام کر رہے تھے۔ اسرائیلی فضائیہ طبی عملے اور ہسپتالوں پر حملے کر رہی تھی۔ آسمان سے میزائل اور زمین سے گولیاں برستی تھیں۔

اسرائیلی فوج نہ صرف امریکی ڈاکٹروں کو نشانہ بنا رہی تھی، جب وہ امریکہ واپس آئے اور جو کچھ دیکھا، وہ بیان کرنا چاہا جو کچھ انہوں نے غزہ میں دیکھا تھا، انہیں مخالفانہ ردعمل سے دوچار ہونا پڑا۔ جب میڈیا کے ساتھ ان کے انٹرویوز شروع ہوئے، انہیں کانگریس کے

قانون سازوں نے یکسر نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔

''امریکی عوام کی دلچسپی سب کچھ جاننے میں تھی۔ لیکن ایوان میں نمائندگان کانگریس انہیں نہ صرف نظر انداز کر رہے تھے بل کہ ان کی دل شکنی کر رہے تھے۔ انہیں مقامی امریکی حلقے بھی مخالفت کے انداز میں لے رہے تھے۔ اس میں مقامی طبی حلقے زیادہ نمایاں تھے۔ وہ بار بار سوال اٹھا رہے تھے کہ بہت بنیادی سہولتیں تو ہر جگہ دستیاب ہوتی ہیں، وہ کیسے انکار کر سکتے ہیں کہ انہیں غزہ میں ان تک رسائی حاصل نہیں تھی۔ ڈاکٹر احمد کا کہنا ہے کہ جب انہوں نے بتایا کہ غزہ میں یہ سہولتیں کیوں کر دستیاب نہ تھیں جب کہ اسرائیلی معاشرے میں یہ ہر جگہ میسر ہوتی ہیں۔

ٹینگ کا کہنا ہے کہ ہر اس فرد کے لیے جو اہل غزہ کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا، یوں لگتا تھا کہ ہم بالکل وجود ہی نہیں رکھتے جو کچھ مدد فراہم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن لوگوں کو یہ باور کرانا ضروری ہے۔ جو وہاں کے سسٹم میں کام کر رہے تھے کہ وہ جو کام کرنے آئے ہیں، وہ کم از کم مناسب طور کہیں کچھ کرنے کا معمولی سا جذبہ بھی نظر آنے پر تفتیش کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا جاتا۔

مزید تفصیلات جاننے کے لیے وہ گفتگو سننا مناسب ہوگا جو تین ڈاکٹروں نے کی، یہ گفتگو یوٹیوب اور سوشل میڈیا کے دیگر آؤٹ لیٹس پر دیکھی اور سنی جا رہی ہے: Spotify پر بھی یہ گفتگو مکمل دستیاب ہے۔

جونا والڈ ویز:۔ انٹرسپٹ بریفنگ میں آپ کو خوش آمدید، میں جونا والڈ ویز ہوں، جو انٹرسپٹ کے ساتھ بہ طور رپورٹر کام کرتا ہے۔

بی بی سی: یہ بریکنگ نیوز ہے، حماس کے ایک اہم ذمہ دار کا کہنا ہے کہ ہم نے غزہ میں غیر مسلح ہونے سے اتفاق کیا ہے۔

فوکس: صدر ٹرمپ ایسا کام کر رہے ہیں جسے طویل عرصے سے ناممکن خیال کیا جا رہا تھا۔ وہ حماس کو غیر مسلح کر لیں گے، اس طرح مستحکم امن قائم ہوگا اور اسرائیلی فوجیں غزہ سے نکل جائیں گی۔

جونا والڈ ویز: آیئے جولائی کی طرف واپس جاتے ہیں۔ صدر ٹرمپ اعلان کرتے ہیں کہ نام نہاد ''بورڈ آف پیس'' پر ایک ڈیل ہوگئی ہے اور حماس غیر مسلح ہو جائے گی۔ اس طرح سیز فائر معاہدے کا اہم حصہ مکمل ہو جائے گا۔

ڈونلڈ ٹرمپ: بہت سے لوگوں نے کہا ہے کہ یہ ڈیل ناقابل فہم ہے۔ یہ نہیں ہوگی۔

جے وی: اگست میں اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو نے اس ڈیل کو مسترد کر دیا تھا۔ انہوں نے فوج نکالنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ (یہاں یہ یاد دلانا ضروری ہوگا کہ اس وقت غزہ کا 70 فیصد علاقہ اسرائیل کے (ناپاک) کنٹرول میں ہے۔)

پی بی ایس: صدر ٹرمپ کا بورڈ آف پیس کہتا ہے کہ یہ امر مسلسل اس مسئلے پر زیر بحث ہے اور اسرائیل سے بات جاری ہے۔ اس ڈیل کو وزیر اعظم بنیامین نیتن یاہو بار بار مسترد کر رہے ہیں۔ وہ ٹرمپ کے منصوبہ کو (تسلیم کرنے کے بعد) مسترد کر رہے ہیں۔ وہ وائٹ ہاؤس میں ہونے والی بحث کو بھی ماننے سے انکار کر رہے ہیں۔

بی بی سی: وہ کہہ رہے ہیں کہ جب تک حماس غیر مسلح نہیں ہوتی، وہ غزہ سے فوج نہیں نکالیں گے۔

بنیامین نیتن یاہو (وی او): اسرائیل 15 نکاتی منصوبہ مسترد کر چکا ہے۔

جے وی: فلسطینیوں پر اسرائیل کی نسل کشی کو تین سال ہونے کو آئے ہیں۔ اور اب بھی اس کے بند ہونے کا کوئی امکان بھی نظر نہیں آتا۔ اکتوبر 2025ء میں آخری فائر بندی ہوئی تھی تب سے اسرائیل مزید 1200 سے زیادہ فلسطینی مار چکا ہے۔ (ابھی حال ہی میں ٹینٹ آبادی پر اس نے حملہ کر کے 112 سے زیادہ کو ہلاک کر دیا ہے۔ مدیر) یہ بات اقوام متحدہ کے ماہرین کہہ رہے ہیں۔ اکتوبر 2023ء سے اسرائیل کم از کم 70 ہزار فلسطینی مار چکا ہے۔ (یہ صہیونی قصائی ہے)۔ اب تک 1,71,000 فلسطینی زخمی ہو چکے ہیں۔ یہ ساری کہانی نہیں ہے۔ ابھی تک علم ہی نہیں کہ غزہ کے ملبے تلے کتنے لوگ جان سے گزر چکے ہیں۔ اس کے باوجود اس کے سخت دباؤ میں ذرہ بھر کمی دیکھنے میں نہیں آئی ہے۔

ایک نئی ڈاکومینٹری (American Doctors) میں غزہ میں خدمات سرانجام دینے والے تین ڈاکٹروں نے وہاں کے حالات سے آگاہ کیا ہے۔ ان ڈاکٹروں نے طبی خدمات سرانجام دینے کے لیے غزہ کا سفر کیا تھا۔ غزہ میں طبی خدمات ادا کرنے والے کارکنوں اور ہسپتالوں کو اسرائیل مسلسل نشانہ بنا رہا تھا۔ جب یہ تین امریکی ڈاکٹرز وہاں پہنچے، فلسطینی، آتش پرست اور یہودی غزہ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ وہاں میڈیسن پر سیاست ہو رہی تھی۔ اس سے وہ سچ بے نقاب ہو رہا تھا کہ ہر شے داؤ پر لگی تھی۔ (امریکین ڈاکٹرز کا کلپ دکھاتا ہے)

ڈاکٹر طاہر احمد: میں چاہتا ہوں کہ آپ غزہ کو اپنی آنکھوں سے خود دیکھیں۔ ہر ہسپتال کو

مکمل تباہ کیا جا چکا ہے۔

ڈاکٹر مارک پرل میوٹر: ایک یہودی ڈاکٹر ہونے کے ناطے مجھے غزہ کے بارے میں کچھ نہیں تھا، میں سوچتا کہ غزہ میں صرف دہشت گرد رہتے ہیں۔

ڈاکٹر طاہر احمد: ہم صرف یہ کہتے رہے کہ خدارا ہسپتالوں پر حملے نہ کرو۔

ڈاکٹر فیروز سدھوا: یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ ہمیں سیاسی حل کی ضرورت ہے۔ ہم امریکی ڈاکٹروں کی حیثیت سے یہ سب ہوتا برداشت نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر مارک پرل: یہی سب کچھ میرے ٹیکس ڈالروں سے کیا گیا۔ تمہارے ٹیکس ڈالروں نے کیا کیا؟ لوگوں کو سچ معلوم ہونا چاہیے۔

(ایک اور کلپ فلم ختم کرتے ہوئے)

جے وی: میں نے ان کو جوائن کیا ہے جنہیں ''امریکن ڈاکٹرز'' کہا جا رہا ہے۔ ڈائریکٹر پوہ سائی ٹینگ نے وہ فلم بنائی تھی سے آسکر ایوارڈ ملا۔ وہ فلم ''سینٹ لوئیس سپرمین'' تھی۔ ان کی ہی فلم Patrice کو ایمی ایوارڈ ملا تھا۔ امریکی ڈاکٹرز ان کی آمد پر ان کی ڈاکومینٹری کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

پوہ سائی: آپ سب کا شکریہ

جے وی: ہمارے ساتھ ڈاکٹر طاہر احمد بھی شامل ہو رہے ہیں۔ انہیں بورڈ نے مستند ڈاکٹر قرار دیا ہے جو ہنگامی حالات میں خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ وہ انسانی بنیادوں پر کام کرتے ہیں۔ انہوں نے غزہ، شام، لبنان، اردن، ترکی اور کینیا میں کام کیا ہے۔ انہوں نے غزہ میں پانچ میڈیکل مشقوں کی قیادت کی ہے۔ انہوں نے 2024ء کے اوائل میں کام کیا۔ انہیں چار بار تب سے اسرائیل نے غزہ میں داخلے سے روک دیا کیوں کہ ان کا ماضی فلسطینی ورثہ سے جا ملتا ہے۔

ڈاکٹر طاہر، ہم آپ کو اس شو میں خوش آمدید کہتے ہیں۔

جے وی: چناں چہ ''امریکن ڈاکٹرز'' کے افتتاحی منظر میں ہم ایک ایمبولینس اور دو بری طرح سے زخمی بچے دیکھتے ہیں۔ وہ خون میں نہلائے ہوئے شدید صدمے سے دوچار ہیں۔ اور پھر ہمارا تعارف ڈاکٹر مارک پرل سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب آرتھو پیڈک (ہڈیوں) کے سرجن ہیں۔ وہ اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہیں۔ وہ فلم بندی کرنے والے سے گفتگو کر رہے ہیں۔

یہ سلسلہ آگے پیچھے ڈاکٹر مارک اور آپ کے درمیان چل رہا ہے۔ پوہ اس بحث میں شامل ہوتے کہتے ہیں کہ کیا وہ ان بچوں کے زخموں کو دھندلا کر دیں؟ وہ ان مناظر کو دیکھ رہے ہیں اور چھ فوت ہو جانے والے افراد کو دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر مارک کہہ رہے ہیں کہ اسرائیل ان سے ان کی زندگی، ان کا وقار چھین لیا ہے۔ تم ان کا وقار سامنے نہیں لا سکو گے جب تک تم ان کی یادیں نہ حاصل کر لو۔ تاہم ان کے جسم ان کی کہانی سنا رہے ہیں۔ ان کو نسل کشی میں بلاقصور مار دیا گیا۔

پوہ: میں حیران ہو رہا ہوں کہ آپ ایسے مناظر کے بارے میں بات بھی کیسے کر سکتے ہیں۔ آپ اور مارک کے ساتھ یہ گفتگو کرتے ہوئے آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے اس فلم کے بارے میں بات ہی کیسے کی؟

پی ٹی: اولاً، شکریہ! جونا! یہ سوال کرنے کا شکریہ، صحافیوں کی حیثیت سے ہمیں اکثر ایسے حالات کا مشاہدہ کرنے کو ملتا ہے۔ ہم کیا دکھا رہے ہیں؟ ہم ان کے بارے میں کیا لکھ رہے ہیں؟ ہم نے کیا دیکھا ہے؟

تم بہت کچھ دکھا رہے ہو، تم نے یہ فلم یہاں دکھا دی! کیوں؟ تم بہت کچھ دکھا رہے ہو، تمہارا پھر شکریہ۔ لوگ دیکھ کر ادھر ادھر ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ کوئی اثر پڑے، ہم چاہتے ہیں کہ لوگ یہ سب دیکھیں تو ہمیں یہ بھی بتایا ہوگا کہ کیا ہو رہا تھا؟ اور سچ یہ ہے کہ سب ہم نے ہی ریکارڈ کیا۔ اگر ہم بہت کچھ دکھائیں گے تو یہ لوگ کہیں گے کہ یہ سچ نہیں ہے۔ پھر ہم نے حقیقت میں سب کچھ لوگوں کو دکھانا بند کر دیا۔ چناں چہ جن مناظر کے بارے میں آپ بات کر رہے تھے، سب کچھ ہم نے واقعی ریکارڈ کیا تھا۔ یہ مارک کے ساتھ دوسرا دن تھا۔ میں نے محسوس کیا اور دیکھا کہ وہ سخت سخت ترین ناراض تھا مجھ سے، کیوں کہ میں جو دکھانا چاہتا تھا، وہ بہت کم تھا، آخر ہمیں کیا اور کس قدر دکھانا چاہیے تھا۔

۔۔اب ہونے والی گفتگو کچھ اس طرح کی تھی۔۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں سب کچھ تخلیقی طور پر دکھانا چاہیے تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہم ساتھ ساتھ اشارہ کرتے جاتے۔ وہ مجھ پر پاگلوں کی طرح برہم تھا۔ اس کی باتیں سمجھ میں آنے والی تھیں۔ وہ یوں کہہ رہا تھا۔۔''اس فلم کے بنانے کا مقصد یہ تھا کہ یہ اثر ڈالنے والی ہوتی۔ تم وہاں کیوں تھے؟ چناں چہ اس نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ پھر مجھے وہی کرنا تھا جن کے پاس سے ہم گزرتے آئے تھے۔ جو موت کی وادیوں میں تھے۔ جونا، اس کی ٹون ایسی بناؤ جیسی کہ فلم ہوتی ہے۔''

۔۔اس میں کیا نکتہ تھا۔ ہم وہاں کیوں ہیں۔۔؟

جونا: اس نوٹ کے ساتھ کہ پہلا سین کیا تھا؟ میں فرض کر رہا ہوں کہ ہمارے مخاطب کون ہیں؟ ہمیں بتانا تھا کہ یہ فلم اس قدر حساس ہے کہ لوگ خود اس کے بارے میں معلوم کرنا چاہیں۔ ہمیں بنانا تھا کہ اسرائیلی اور امریکی فوج کس قدر طاقت ور تھی، سارے میڈیا کے ادارے ان کے ساتھ تھے۔ میرے لیے حقیقی واقعات دکھانے کے علاوہ کہ وہ ظلم تھے، سفاک تھے، کہ وقت کے دھارے نے دکھایا کہ سب کس قدر تکلیف دہ ظلم تھا۔

ڈاکٹر طاہر: فلم آپ کو اور دوسرے دو امریکی ڈاکٹروں کو ساتھ ساتھ لے چلتی ہے۔ ڈاکٹروں سے ایک ٹراما سرجن تھا۔ وہ ڈاکٹر فیروز سدھوا تھا۔ پھر ہم تینوں نے فیصلہ کیا کہ ہم غزہ میں خدمت کر رہیں گے۔ سیز فائر اکتوبر 2025ء بھی اب دور نہیں تھی۔

ہمیں یاد کرائیں کہ غزہ میں کیا صورت حال تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مارچ 2025ء میں اموات کی تعداد پہلے ہی 50 ہزار سے تجاوز کر چکی تھی۔ تب اسے گزرے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ مرنے والوں کی تعداد کہیں تجاوز کر چکی تھی۔ اسرائیل کی نسل کشی کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔

طاہر احمد: لوگوں کے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ اس وقت کے قریب ٹرمپ انتظامیہ نے ایک امن ڈیل پر کام کر لیا تھا جس کا مقصد سیز فائر کرنا تھا، اسے اس ڈیل کے اوپر نافذ کرا دیا گیا۔ ہم جوں ہی اس پہلے مرحلے کے قریب پہنچ رہے تھے اور یہ مارچ 2025ء تھا۔ یہ بہت زیادہ واضح ہو چکا تھا کہ اسرائیل کی فوج ایک نئے حملے کی تیاری کر رہی تھی۔ حقیقت میں اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ اسی دوران میں بمباری کا دوبارہ آغاز ہو گیا تھا۔ اسرائیلی فوج پہلے ہی ایسی سخت ناکہ بندی کر چکی تھی کہ دم گھٹتا تھا۔

غذا کی کمی اس قدر شدید تھی کہ قحط کا الارم بہت پہلے بج چکا تھا۔ اسے famine early warning systems کہتے ہیں۔ یہ بہت تشویش ناک صورت حال تھی۔ بھوک کو

جنگ کے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے جنگی جہازوں میں تیل بھرا جاتا تھا۔ یہ جہاز بھوک کے اس حملے کے لیے استعمال کیے جا رہے تھے۔ ان کی بمباری سے غزہ میں خوراک کے ذخیرے تباہ کی جا رہے تھے۔

ہنگامی بنیادوں پر میڈیکل ٹیموں کے ساتھ کام کرنے والے کارکن دیکھ رہے تھے کہ نسل کشی اب نئے طریقوں سے کی جا رہی تھی۔ ہم میں سے بہت سے کارکن۔۔ میں، فیروز اور مارک۔۔ ہم منصوبہ بنا رہے تھے کہ ایک بار پھر غزہ جایا جائے۔ یہ مارچ کا مہینہ تھا۔ اس وقت ہم اردن جا رہے تھے۔ وہاں وہ ڈاکٹر جو بین الاقوامی کام کرتا تھا، یا نرس کہیں بھی جا رہے تھے۔ وہ غزہ دوبارہ داخل ہونے کے لیے منظوری کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ منظوری اسرائیلی فوج دیتی تھی۔ اس کے بعد ہی کوئی جیریکو کے راستے داخل ہو سکتا تھا۔ پھر وہاں سے غزہ کا سفر کیا جاتا۔ پھر مجھے کہا گیا کہ آپ کو داخل ہونے کی منظوری نہیں دی گئی۔ اس وقت ہم اردن میں تھے۔ ہمارے ساتھ فلم بندی کرنے والے لوگ بھی تھے۔ مارک اور فیروز کو پھر داخلے کی منظوری مل گئی۔ وہ اب فلسطین میں داخل ہو سکتے تھے۔ پھر مجھے (ڈاکٹر طاہر) کو منظوری دینے سے انکار کر دیا گیا۔ یہ وہ کام تھا جو کہیں پس منظر میں ہو رہا تھا۔ یہ صرف ایک فلم کا معاملہ نہیں تھا۔ لیکن یہ سب مسلسل ہو رہا تھا۔ ہمیں غزہ میں داخل ہونا تھا۔

تم ہر چیز کے بارے میں بات کر رہے ہو جس میں غذا، پانی، ڈاکٹرز، نرسیں، ڈیزل شامل تھے۔ یہ سب چیزیں ایک منصوبے کے تحت روک دی گئیں۔ پھر میرے جیسے لوگ جو 2008ء سے کئی بار غزہ جا چکے تھے۔ یہ وہ حالات تھے جن کا ہم سامنا کر رہے تھے۔ کہنے کو وہاں ''جنگ بندی'' تھی اور شاید ٹرک غزہ داخل ہو رہے تھے۔ لیکن غزہ کی پٹی میں ہو کیا رہا تھا۔ ایک بار وہ سپلائی کاٹ دیتے تھے، پھر اسرائیلی محاصرہ زیادہ شدید کر دیتے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ لوگ زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

جے وی: پوہ ہم جانتے ہیں جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، یہ فلم ان کو فیچر ڈاکومینٹری ڈائریکٹر بنا رہی تھی، وہ حیران تھا۔ ڈاکٹر مارک آغاز سے ہی پرامید رہتے تھے۔ جب ہم بہت پہلے ملے تھے، وہ تب بھی ویسے ہی تھے، میں آپ کو ایک نرس کے طور پر تربیت دوں گا اور پھر غزہ لے جاؤں گا۔

اب ہم جانتے تھے کہ فلسطین کے بارڈرز کون کنٹرول کر رہا تھا۔ میرے نام کو کوئی تھوڑا سا بھی تلاش کرنا چاہتا، وہ کیا تلاش کر لیتا تھا؟ نیویارک ٹائمز کے ساتھ کام کرنے والے صحافی، الجزیرہ انگریزی کے سابق کمشنز اور میں دی ایسوسی ایٹڈ پریس کے ساتھ بھی کام کر رہے تھے۔ میں اے بی سی ڈزنی کے ایک ایگزیکٹو کے طور پر کام کرنے لگا تھا۔ میرے لیے یہ سب نہ ہونے کے برابر تھا۔

پھر مجھے ایک زبردست پروڈیوسر سے ملنے کا اچانک موقع ملا۔ یہ ریم حداد تھیں۔ میں الجزیرہ انگریزی کے لیے بھی کام کرتا رہتا تھا۔ ریم حداد MENS کو دیکھتی تھیں۔ یہ مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے ممالک تھے۔ ریم اس وقت ان پر کام کر رہی تھی۔ میرے خیال میں 2023ء کا اختتام ہو رہا تھا۔ یہ ایک زبردست غزہ ٹیم بن گئی تھی۔ ہمارے ساتھ ایک اور پروڈیوسر محمد صوات آن ملے تھے۔ ہمارے ڈائریکٹر فوٹوگرافی ابراہیم الاوطلا تھے۔ انہوں نے 2023ء کے آخر میں ایک دستاویزی فلم بنائی تھی۔ میں بھی اب ان کے ساتھ تھا۔ ''کیا ہم ایک ٹیم بن کے کام کر سکتے ہیں؟ ہم غزہ میں ایک فلم بنانا چاہتے ہیں۔ اس طرح ہم نے ناصر میڈیکل کامپلیکس کو اپنا مرکز بنا لیا تھا۔

ایمان داری کی بات ہے۔ یہ فلم ان سب کے اعزاز میں بنائی گئی جنہوں نے جو دیکھا، وہ کن حالات میں رہنے پر مجبور کر دیے گئے تھے۔ میں یہ بھی بتانا چاہوں گا، ان کے ختم ہونے پر یہ ساری پروڈکشن، بہت سی ٹیمیں بنا چکی تھی۔ اب ہم آٹھ مختلف ممالک کے افراد تھے۔ کوئی فرد ایک نہیں تھا جس طرح کوئی ملک ایک ملک نہیں تھا۔ سب نے مل کر یہ کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب دنیا کے مختلف حصوں کے لوگ مل رہے تھے۔ یہ سب کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ وہ دنیا کو دکھانا چاہتے تھے کہ غزہ میں کیا ہو رہا ہے۔

جے وی: آپ کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے، اسرائیل نے اب تک غزہ میں بین الاقوامی صحافیوں کو غزہ داخل ہونے نہیں دیا۔ فلسطینی صحافی ہی اب تک جنگ کی دستاویز بندی کے عینی شاہد ہیں۔ ڈاکٹر وکو، ڈاکٹر طاہر اور میڈیکل کارکنوں اور دونوں اور جن کو داخلے کی اجازت دی ہے۔

اگر آپ یاد کریں، مجھے تو یاد نہیں پڑتا، لیکن ڈاکٹر طاہر آپ کو اور مجھے اپنی آواز اور متن کو باہم جوڑنے کا سال مارچ میں موقع مل سکا ہے۔ اس وقت میں اسرائیلی حکومت کے بارے میں لکھ رہا تھا۔ وہ ڈاکٹروں کو تب غزہ چھوڑنے سے روک رہی تھی۔ اس کی وجہ سے زخمیوں کی دیکھ بھال کا سارا پروگرام خراب ہوا۔ اور جس طرح آپ وضاحت کر رہے تھے، یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ آپ کو وہاں جانے سے روکا گیا۔ یہ بالکل تازہ جنگ بندی تھی جو اکتوبر 2025ء میں طے پائی تھی۔

آپ ہمارے ساتھیوں سے جو کچھ سن رہے ہیں، جب آپ وہاں تھے، معاملات کس طرح تبدیل ہوئے تھے۔ یہ پہلی سیز فائر کا موقع تھا۔ معاملات بالکل ویسے کسی طرح ہو سکتے تھے۔

طاہر احمد: عمومی طور پر صحت عامہ پر پڑنے والا دباؤ تباہ کن تھا۔ چناں چہ آپ ہمارے ساتھیوں سے روزانہ کچھ نہ کچھ سن رہے ہیں۔ ان کے پاس وہ سامان ہی پہنچا تھا جس سے وہ مریضوں کی دیکھ بھال کر سکتے۔ انہیں کسی نوعیت کی بنیادی ضمانت بھی تو حاصل نہیں تھی۔ ہر چیز پر سیکیورٹی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ انہیں صرف روایتی طریقوں سے کام کی اجازت تھی۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ سب سے بڑی علامت یا نشانی کہ جب صحت عامہ کے نظام پر مسلسل حملے ہو رہے تھے اور وہ حملے اس قدر تباہ کن تھے کہ ان افراد کی پوری فہرست بن گئی تھی جن کو ہر حال میں غزہ سے باہر منتقل کیا جانا ضروری تھا تاکہ ان کا علاج معالجہ ہو سکے۔ یہ تعداد 15 سے شروع ہو کر پورے 18000 تک جا پہنچی تھی۔ یہ سارا دارومدار اس بات پر تھا کہ آپ کیا استعمال کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو فوری طور پر غزہ سے باہر لے جایا جانا لازمی تھا۔ اس وجہ صاف طور پر یہ تھی کہ انہیں جس طرح کا طبی علاج درکار تھا، وہ غزہ میں نہیں تھا۔ لیکن ایسا اس لیے ممکن نہیں تھا کہ محاصرہ اور ناکہ بندی بہت سخت ترین تھے۔ اسرائیلی فوج کا حال یہ تھا کہ پرندہ پر بھی مار نہیں سکتا تھا۔

ہم مطالبہ کر رہے تھے کہ غزہ میں کینسر میں مبتلا بچے ہیں جن کا مکمل علاج کیا جا سکتا تھا، وہ اپنے کینسر کی وجہ سے مر رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں مقبوضہ مشرقی بیت المقدس (مشرقی یروشلم) کے ہسپتال میں بھی جانے سے روک دیا گیا تھا۔ وہاں المقاصد یا آگسٹا وکٹوریہ ہسپتال تھے جہاں ان بچوں کا علاج ہو سکتا تھا۔

(جاری ہے)

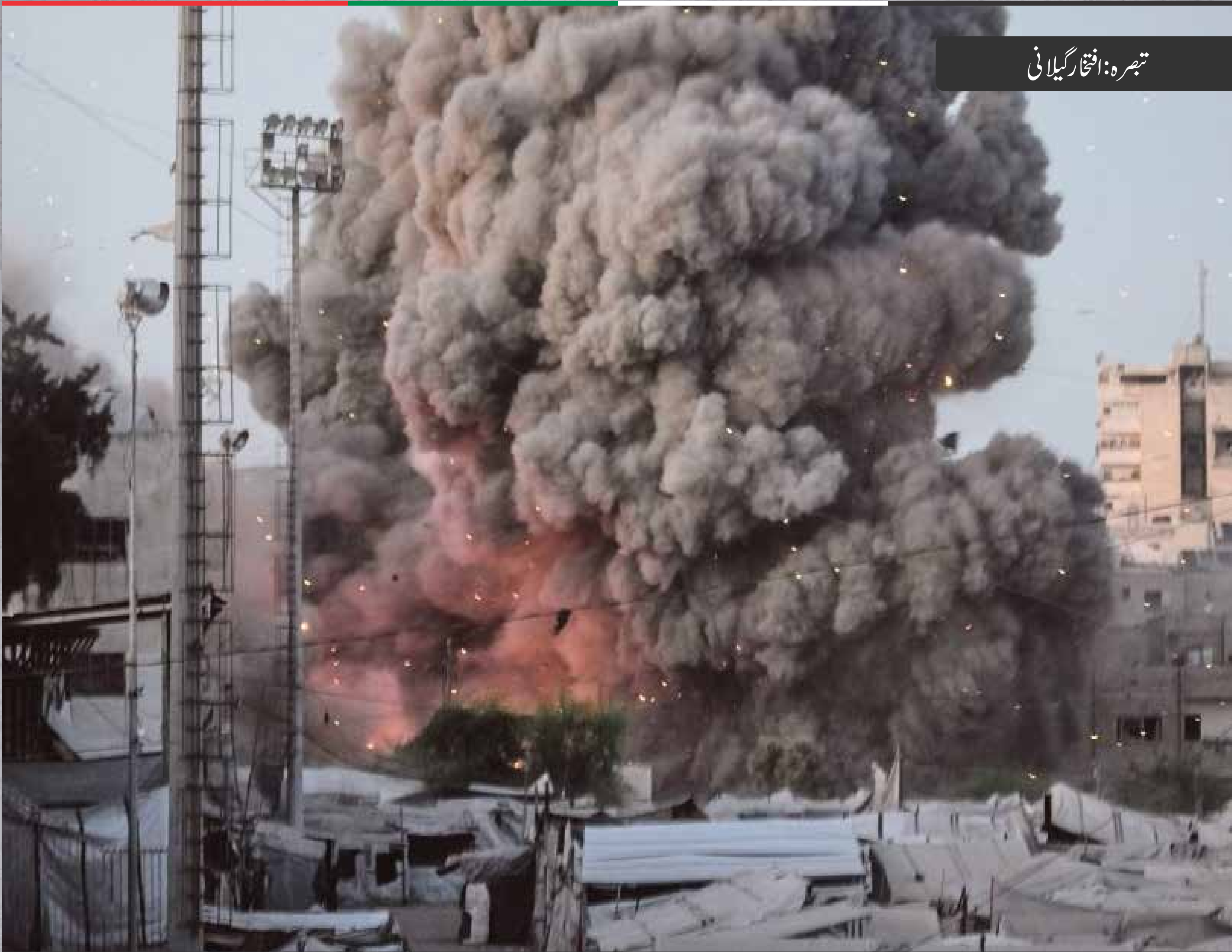

تبصرہ: افتخار گیلانی

کس طرح ہندوستان نے غزہ جنگ میں اسرائیل کی عسکری مدد کی

مئی 2024 میں اسپین کی کارٹیجینا بندرگاہ کے گودی مزدور اس وقت ششدر رہ گئے جب انہیں معلوم ہوا کہ ہندوستان کے شہر چنئی سے روانہ ہونے والا ایک تجارتی مال بردار جہاز ’بورکم‘ عسکری سامان لے جا رہا تھا، اور اس کی حتمی منزل غزہ سے بہ مشکل 30 کلومیٹر دور واقع اسرائیل کی اشدود بندرگاہ تھی۔

یہ ایک ایسا وقت تھا جب غزہ پر اسرائیلی عسکری جارحیت اپنے عروج پر تھی، اور عوام کے شدید اور بڑھتے ہوئے دباؤ کی وجہ سے بیشتر یورپی حکومتوں نے اسرائیل کو گولہ بارود کی ترسیل روک دی تھی۔

ہسپانوی مزدوروں کے احتجاج کے بعد حکومت نے بالآخر اس جہاز کو لنگر انداز ہونے اور ایندھن کی فراہمی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

کسٹم کے دستاویزوں سے یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ اس کھیپ میں 20 ٹن راکٹ انجن، 5.12 ٹن بارودی مواد سے لیس راکٹ اور 1,500 کلوگرام مخصوص دھماکہ خیز مواد شامل تھا، جسے ہندوستانی دفاعی کمپنیوں نے تیار کیا تھا، جن میں ’پریمیئر ایکسپلوسیوز لمیٹڈ‘ اور سرکاری ملکیت والی ’مینوشنز انڈیا لمیٹڈ‘ شامل تھیں۔

ابھی اس واقعہ کو ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ 6 جون 2024 کو وسطی غزہ کے نصیرات پناہ گزین کیمپ میں ایک اسرائیلی فضائی حملے نے اقوام متحدہ کے ایک اسکول کو نشانہ بنایا، جو عام شہریوں کے لیے پناہ گاہ کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔

جب مقامی رہائشی ملبے سے زندہ بچ جانے والوں کو تلاش کر رہے تھے، تو انہوں نے اس میزائل کے ٹکڑوں کی ویڈیو بنائی جس نے اس احاطے کو تباہ کر دیا تھا۔

ملبے کے درمیان اس میزائل کی باقیات پر ایک تحریر بالکل واضح طور پر نظر آ رہی تھی: ”میڈ ان انڈیا“ یعنی ہندوستان میں تیار کردہ۔ اس وحشیانہ حملے میں اسکول کے اندر پناہ لینے والے کم از کم 33 فلسطینی ہلاک اور درجنوں زخمی ہوئے۔

حال ہی میں، اسرائیلی وزیر اعظم بنجمن نیتن یاہو نے امریکی نائب صدر جے ڈی وینس کے اس دعوے کے جواب میں کہ امریکہ ہی اسرائیل کا واحد ناگزیر اتحادی ہے، پر یہ تبصرہ کیا کہ اسرائیل کے پاس ہندوستان کی شکل میں ایک طاقتور دوست موجود ہے۔ ان کا یہ تبصرہ، کچھ غلط نہیں تھا۔

حال ہی میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کی 42 صفحات پر مشتمل ایک تحقیقاتی رپورٹ کی اشاعت کے بعد اس پر مہر لگ گئی کہ کس طرح بین الاقوامی انسانی ضابطوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ہندوستان نے اسرائیل کی جنگی دفاعی سپلائی چین میں ایک کلیدی کردار ادا کیا۔

ایمنسٹی نے کسٹم کے ریکارڈ، کارپوریٹ فائلنگز، جہاز رانی کے گوشواروں اور برآمدی ریکارڈ کا باریک بینی سے جائزہ لے کر اس پورے نیٹ ورک کی کڑیاں جوڑ کر ایک ایسا ڈیٹابیس تیار کر دیا ہے، جو بتاتا ہے کہ 7 اکتوبر 2023 سے 30 نومبر 2025 کے درمیان ہندوستان سے اسلحہ کی 2,596 کھیپیں اسرائیل روانہ کر دی گئی تھیں۔

ان کھیپوں میں عسکری ہتھیار، گولہ بارود کے پرزے، بکتر بند گاڑیوں کے پرزے اور دیگر دفاعی سامان شامل تھے جو اسرائیلی مسلح افواج یا اسرائیلی دفاعی کمپنیوں کو فراہم کیے گئے۔ ایمنسٹی نے نتیجہ اخذ کیا کہ:

غزہ میں اسرائیل کی عسکری مہم کے دوران، ہندوستان اسرائیلی مسلح افواج سے قریبی تعلق رکھنے والی اسرائیلی کمپنیوں کے لیے عسکری پرزہ جات، گولہ بارود کے اجزاء اور دفاعی سامان کا ایک اہم سپلائر بن کر ابھرا۔

غزہ جنگ شروع ہونے کے بعد جیسے ہی یورپی حکومتوں پر عسکری برآمدات معطل کرنے کے لیے داخلی سطح پر دباؤ بڑھا، ہندوستان کے دفاعی مینوفیکچرنگ سیکٹر نے خاموشی سے اس خلا کو پر کر دیا۔

ہندوستان نے نہ صرف انفرادی عسکری مصنوعات برآمد کیں، بلکہ وہ اس صنعتی نظام میں ایک انتہائی اہم درجے کا سپلائر بن گیا جس نے اسرائیل کی دفاعی پیداوار کو برقرار رکھنے میں مدد کی۔

ایمنسٹی نے ہندوستان سے بھیجے گئے 3,90,516 ملٹری گریڈ کے چھوٹے ہتھیاروں کے پرزہ جات کی نشاندہی کی ہے۔ ان میں خودکار ہتھیاروں، ٹرگر کے طریقہ کار، بیرل اور دیگر وہ تمام پرزے شامل ہیں جو خاص طور پر عسکری آتشیں اسلحے کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔

تحقیق کاروں نے 5,64,790 دھماکہ خیز مواد اور اس کے اجزاء کی نشاندہی کی ہے، جن میں آرٹلری شیل کے خول، ڈرون کے وارہیڈ کے پرزے اور گولہ بارود کی تیاری کے لیے استعمال ہونے والے دیگر حصے شامل ہیں۔ رپورٹ میں نوٹ کیا گیا ہے؛

جمع کیے گئے شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ زیرِ تحقیق مدت کے دوران ہندوستان سے اسرائیلی دفاعی کمپنیوں کو عسکری اجزاء کی منتقلی کا ایک مسلسل اور باقاعدہ سلسلہ جاری رہا۔ اس تحقیقاتی رپورٹ میں عسکری گاڑیوں کے 298 پرزوں کا بھی ریکارڈ موجود ہے، جو اسرائیلی مسلح افواج کے لیے سامان تیار کرنے والے اسرائیلی مینوفیکچررز کو فراہم کیے گئے تھے۔

اس رپورٹ کی سب سے نمایاں دریافت یہ ہے کہ اس سپلائی چین میں سرکاری شعبے کے ادارے اور نجی صنعت دونوں یکساں طور پر شامل تھے۔ حکومت کی ملکیت والی ڈیفنس پبلک سیکٹر انڈرٹیکنگز میں، ایمنسٹی نے 'مینوشنز انڈیا لمیٹڈ'، 'ایڈوانسڈ ویپنز اینڈ ایکوپمنٹ انڈیا لمیٹڈ'، اور 'انڈیا آپٹل لمیٹڈ' کو ایسے مینوفیکچررز کے طور پر ظاہر کیا ہے جن کی مصنوعات زیرِ مطالعہ مدت کے دوران اسرائیلی دفاعی سپلائی چین کا حصہ بن گئیں۔

یہ کمپنیاں مکمل طور پر حکومتِ کی ملکیت ہیں اور 2021ء میں 'آرڈیننس فیکٹری بورڈ' کی از سرِ نو تنظیم کے بعد قائم کی گئی تھیں۔

ان کے ساتھ ساتھ کئی نجی کمپنیاں بھی اس صف میں کھڑی ہیں، جن میں 'پریمیئر ایکسپلوسیوز لمیٹڈ'، 'کلیانی اسٹریٹیجک سسٹمز'، 'انڈو-ایم آئی ایم'، 'اشوکا مینوفیکچرنگ' اور دیگر شامل ہیں جو آرٹلری کے اجزاء، دھماکہ خیز مواد، باریک بینی سے تیار کردہ انجینئرنگ پروڈکٹس اور دھاتی پرزے بنانے میں مصروف ہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب ایمنسٹی انٹرنیشنل کی اس تحقیق پر ہندوستان، پاکستان و مغرب کے زیادہ تر روایتی میڈیا نے مکمل خاموشی اختیار کر لی۔ دنیا کے بڑے اور بااثر ترین خبری اداروں نے اس پر کوئی مخصوص رپورٹ شائع نہیں کی۔

جہاں بی بی سی کی مرکزی انگریزی سروس نے اس رپورٹ کو نظر انداز کیا، ہندی سروس نے اس خبر کو ہندوستانی حکومت کے ردِعمل کے زاویے سے پیش کیا۔ تقریباً تمام ہندوستانی میڈیا آؤٹ لیٹس کا رویہ بھی ایسا ہی رہا۔

انہوں نے رپورٹ کے مندرجات کو شائع کرنے کے بجائے وزارتِ خارجہ کے ترجمان کے بیان پر توجہ مرکوز کی، جس میں بتایا گیا کہ اسرائیل کو تمام اسلحے کی منتقلی قانونی اور بین الاقوامی قوانین کے مطابق تھی۔ اسی طرح زیادہ تر مرکزی ہندوستانی ٹیلی ویژن نیٹ ورکس اور قومی اخبارات نے بھی اس رپورٹ کو برائے نام اہمیت دی یا بالکل نظر انداز کر دیا۔

یہ تغافل اور خاموشی اس لیے بھی نمایاں ہے کیونکہ انھی مغربی اداروں نے غزہ میں اسرائیل کی فوجی مہم، انسانی المیے، یرغمالیوں کے مذاکرات، جنگ بندی کی سفارت کاری، اور خاص طور پر اسرائیل کو مغربی فوجی امداد کو کور کرنے کے لیے وسیع کوریج دی۔

پچھلے دو سالوں کے دوران، رائٹرز، اے پی، بی بی سی، سی این این، دی ٹائمز، اور دی پوسٹ ان تمام اداروں نے امریکی فوجی امداد، برطانوی برآمدی لائسنسوں، جرمن اسلحے کی منظوریوں، اور مغربی ہتھیاروں کی منتقلی کو روکنے کے لیے عدالتوں میں دائر مختلف چیلنجز پر باریک بینی سے رپورٹنگ کی ہے۔ جس کی وجہ سے اسرائیل کو گولہ بارود کی فراہمی روکنے کے لیے یورپ میں رائے عامہ بڑی حد تک ہموار ہو گئی۔

تاہم، اسی سپلائی چین میں ہندوستان کے مبینہ کردار سے متعلق ایمنسٹی کی اس تحقیقات پر ان اداروں نے کیوں توجہ نہیں دی، ایک معمہ ہے۔

ایمنسٹی کی اس رپورٹ میں سب سے زیادہ انکشاف کرنے والے وہ مشترکہ منصوبے ہیں جو ہندوستان اور اسرائیل کے درمیان بڑھتے ہوئے گہرے صنعتی تعلقات کی عکاسی کرتے ہیں۔

رپورٹ میں 'پی ایل آر سسٹمز' کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے جو 'اسرائیل ویپن انڈسٹریز' کے ساتھ ایک مشترکہ منصوبہ ہے، اور 'الفائل سیک ڈیفنس اینڈ ایرواسپیس سسٹمز' کا جو 'البٹ سسٹمز' کے ساتھ قائم کیا گیا ہے۔

ایمنسٹی کی تحقیقات میں جن مصنوعات کی نشاندہی کی گئی ہے، وہ کسی گمنام عالمی منڈی میں منتقل نہیں ہوئی تھیں۔ رپورٹ کے مطابق، ان میں سے بیشتر مصنوعات اسرائیل کی تین سب سے بڑی دفاعی کمپنیوں کو بھیجی گئیں: البٹ سسٹمز، اسرائیل ایرواسپیس انڈسٹریز، اور رافیل ایڈوانسڈ ڈیفنس سسٹمز۔

ایمنسٹی ان فرموں کو اسرائیلی فوج کا اہم سپلائر قرار دیتی ہے اور اس کا استدلال ہے کہ اکتوبر 2023ء کے بعد بھی ان کمپنیوں کو سامان کی مسلسل منتقلی ہی اس کی تحقیقات کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس تمام تر صورتِ حال سے جو تصویر ابھرتی ہے، وہ ایک روایتی برآمدی منڈی کی نہیں بلکہ ایک مربوط صنعتی نیٹ ورک کی ہے۔

ہندوستانی کمپنیاں پرزہ جات تیار کرتی ہیں، اور اسرائیلی دفاعی فرمیں انہیں بڑے ہتھیاروں کے نظاموں میں مربوط کر دیتی ہیں۔ ایمنسٹی کا موقف ہے کہ وہی ہتھیار اور نظام بالآخر اسرائیل کی عسکری کارروائیوں کا حصہ بنتے ہیں۔

دہائیوں تک ہندوستان کی شناخت بنیادی طور پر دنیا کے سب سے بڑے عسکری سامان کے درآمد کنندگان میں ہوتی رہی۔ اسرائیل اس کے اہم سپلائرز میں سے ایک تھا، خاص طور پر 1999ء کی کرگل جنگ کے بعد، جب نئی دہلی نے اسرائیلی نگرانی کے نظام، ڈرونز، میزائلوں اور درست نشانہ بنانے والے منیشنز کی طرف بڑے پیمانے پر رجوع کیا۔

مودی حکومت کے خودکفیل بھارت اور "میک ان انڈیا" کے نعروں نے غیر ملکی دفاعی مینوفیکچررز کو ہندوستان کے اندر پیداواری سہولیات قائم کرنے کی ترغیب دی۔ اسرائیلی کمپنیاں اس پالیسی کو اپنانے والوں میں سب سے آگے تھیں، جنہوں نے ڈرون، گولہ بارود، درست انجینئرنگ مصنوعات اور میزائل کے پرزے تیار کرنے کے لیے ہندوستانی فرموں کے ساتھ مشترکہ منصوبے شروع کیے۔ وقت کے ساتھ ساتھ، ہندوستان صرف ایک گاہک نہیں رہا بلکہ اسرائیل کے دفاعی پیداواری نیٹ ورک کا ایک لازمی اور غیر منفک حصہ بن گیا۔

ایمنسٹی کی رپورٹ کے مطابق اس سپلائی چین کے ایک سرے پر ہندوستانی مینوفیکچررز ہیں۔ ان میں سے کچھ سرکار کی ملکیت والی ڈیفنس پبلک سیکٹر انڈرٹیکنگز ہیں جو 2021ء میں آرڈیننس فیکٹری بورڈ کی ازسرِ نو تنظیم کے بعد قائم ہوئی تھیں اور نجی انجینئرنگ فرمیں ہیں جو باریک پرزہ جات کی اہم سپلائر بن کر ابھری ہیں۔ دوسرے سرے پر اسرائیل کی دفاعی صنعت کے تین مضبوط ستون کھڑے ہیں: البٹ سسٹمز، اسرائیل ایرو اسپیس انڈسٹریز، اور رافیل ایڈوانسڈ ڈیفنس سسٹمز۔

یہ کمپنیاں اسرائیل کے سب سے مشہور عسکری پلیٹ فارمز تیار کرتی ہیں، جن میں ڈرون، گائیڈڈ منیشنز، میزائل سسٹمز، آرٹلری اور الیکٹرانک وارفیئر ٹیکنالوجیز شامل ہیں۔ ایمنسٹی کے مطابق، ہندوستانی ساختہ پرزے 7 اکتوبر 2023ء کے بعد ان تینوں کمپنیوں کی سپلائی چین میں شامل ہوئے ہیں۔

اسرائیل کے ساتھ ہندوستان کی اسٹریٹجک شراکت داری کے حامیوں کا استدلال ہے کہ دفاعی تعاون ایک خودمختار پالیسی کا فیصلہ ہے جو قومی سلامتی، ٹکنالوجیکل تعاون اور معاشی مواقع سے منسلک ہے۔ ہندوستان نے دفاعی مینوفیکچرنگ کا عالمی مرکز بننے کے لیے بھاری سرمایہ کاری کی ہے، اور برآمدات اس عزائم کا مرکزی حصہ ہیں۔

ہندوستانی وزارت خارجہ نے ترجمان نے بھی اس دفاعی سپلائی چین کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ اسرائیل کو ہتھیار بین الاقوامی قوانین اور داخلی قوانین کے تحت فراہم کئے گئے۔ یہ سچ ہے کہ 1971ء کی پاک ہند جنگ کے دوران، اسرائیل نے امریکہ ناراضگی کو درکنار کرتے ہوئے ہندوستان کی خفیہ طور پر انتہائی اہم مدد کی۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ بنگلہ دیش کی فتح کا سہرا ہندوستانی فوج کے ایک یہودی جنرل جے ایف آر جیکب کے سر بندھنے والا تھا۔ ان ہی کی یونٹ سب سے پہلے ڈھاکہ پہنچ گئی تھی اور انہوں نے ہی پاکستانی فوج کی ایسٹرن کمانڈ کے سربراہ جنرل نیازی کو ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرایا تھا۔

مگر عین وقت پر وزیر اعظم اندرا گاندھی نے کلکتہ میں مقیم بھارتی جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کو ڈھاکہ پہنچ کر اس ہتھیار ڈالنے کی رسم کی سرپرستی کرنے کی ہدایت کی۔ وہ شاید جانتی تھی کہ ایک یہودی جنرل کے سامنے کسی پاکستانی مسلمان جنرل کا ہتھیار ڈالنا عرب اور اسلامی ممالک میں ایشو بن سکتا ہے۔

جنرل جیکب نے آخر وقت تک کانگریس اور اندرا گاندھی کو اس کے لیے معاف نہیں کیا۔ وہ اس بات پر بھی خفا تھے کہ ان کو آرمی چیف بھی بننے نہیں دیا گیا۔ ریٹائرمنٹ کے برسوں بعد کرگل جنگ کے بعد 1999 میں اٹل بہاری واجپائی حکومت نے ان کو گوا اور پھر پنجاب کا گورنر بنا دیا تھا۔ ان کی وردی، فوٹو اور میڈیلز تل ابیب کے یہودی ملٹری میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے 1971 میں سفارتی تعلقات نہ ہونے کے باوجو 160 ملی میٹر اور 105 ملی میٹر کے مارٹر، گولہ بارود اور ریڈار سسٹمز اسرائیل نے ہندوستان کو فراہم کیے تھے۔

یہ ہتھیار لکسمبرگ اور لیچٹنسٹائن جیسے تیسرے مقامات کے ذریعے ہندوستان پہنچ گئے تھے اور وزیر اعظم اندرا گاندھی کے پرنسپل سکریٹری پی این ہکسر خود اس آپریشن کی نگرانی کر رہے تھے۔ اسی طرح اسرائیل نے بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے لڑنے والی گوریلا فورس 'مکتی باہنی' کو بھی خاموشی سے مالی و عسکری امداد اور سامان فراہم کی۔

امریکہ اور برطانیہ اس وقت علانیہ طور پر پاکستان کے ساتھ کھڑے تھے۔ اسی طرح کرگل جنگ کے وقت، جب جوہری دھماکوں کی وجہ سے ہندوستان پر پابندیاں عائد تھیں، اسرائیل نے گولہ بارود کی ترسیل کو یقینی بنایا۔ اس کے علاوہ اسرائیلی 'ہیرون' اور 'سرچر' نامی فضائی گاڑیاں بھی روانہ کیں، جنہوں نے زمینی فوج اور فائٹر جیٹس کو انتہائی درست معلومات فراہم کیں۔

اس پس منظر میں ہندوستانی دفاعی ماہرین کا کہنا ہے کہ یورپ کا دروازہ بند ہونے کے بعد جب اسرائیل نے مدد کی درخواست کی، تو کوئی بھی ہندوستانی حکومت اس کو مسترد نہیں کر سکتی تھی۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا غزہ کی اس جنگ میں اسرائیل کی سالمیت یا اس کے وجود کو کوئی خطرہ لاحق تھا؟ وہ یہ جنگ کسی ملک کے خلاف نہیں بلکہ ایک مزاحمتی گروپ اور فلسطینی غیر مسلح عوام کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اس کو کسی ایئر فورس نہ کسی باضابطہ فوج کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ تو فلسطینی عوام کی نسل کشی پر آمادہ تھا۔

ہندوستانی سفارتی نکتہ نظر یہ سے بھی مدد کرنے کا استدلال درست تبھی ہو سکتا تھا، اگر کسی باضابط جنگ میں اسرائیل کے وجود کو خطرہ لاحق ہوتا۔ مگر نسل کشی پر آمادہ کسی بھی فوج کو گولہ بارود فراہم کرنے کا مطلب بس اتنا ہی ہے کہ آپ کے ہاتھ بھی بے گناہوں کے خون سے رنگ گئے ہیں۔

سالہا سال سے، اسرائیل کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات پر بات چیت صرف سربراہی اجلاسوں، انٹلی جنس تعاون، میزائل سودوں اور اقوام متحدہ میں ووٹنگ کے پیٹرن تک محدود رہی۔ لیکن ایمنسٹی کی اس رپورٹ نے اس گفتگو کا رخ اب فیکٹریوں، مشین شاپس، ڈھلائی کے کارخانوں، کسٹمز دفاتر اور شپنگ مینوفیسٹس کی طرف موڑ دیا ہے۔

نیتن یاہو کا یہ تبصرہ کہ ہندوستان، اسرائیل کے مضبوط ترین حامیوں میں سے ایک ہے، بظاہر ایک سفارتی تعریف ہے، مگر یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ ہندوستان اسرائیل کی پیداواری لائنوں، برآمدی کھیپوں اور دفاعی سپلائی چین کا حصہ بن چکا ہے۔

آئینہ ایام: عبدالقیوم فہمید

صیہونی ریاست کا اصل چہرہ: یہودی دانشور کے سنسنی خیز انکشافات

کس طرح اسرائیل سرنگوں، دیواروں، اور شہری انفراسٹرکچر کو فلسطینیوں کی نسل کشی اور محاصرے کے لیے استعمال کرتا ہے؟

انڈر گراؤنڈ نگ: یہودی دانشور کے قلم سے اسرائیلی درندگی کا پردہ چاک

فلسطینی قوم کے وجود کو مٹا دینے اور اس ریشم وگل جیسی دھرتی کو خاکستر کرنے کی ہوس میں مبتلا نام نہاد صہیونی ریاست نے زمین پر جو قیامتیں ڈھائی ہیں، ان کا تذکرہ سن کر پتھر دل بھی موم ہو جائیں۔ انسانیت کے سینے پر خنجر چلانے والے ان سفاکوں نے درندگی کے وہ تمام دروازے کھول دیے جن کی ہولناکیوں سے روحیں تک کانپ اٹھتی ہیں۔ ایک طرف تو جدید ترین اور مہلک ترین ہتھیاروں کے ذریعے انسانوں، بستیوں اور تہذیبوں کا بے دردی سے صفایا کیا گیا اور دوسری طرف اسی مجرم صہیونی ریاست نے مظلومیت کا روپ دھار کر اپنے اس مکارانہ بیانیے کو دنیا کے ماتھے پر سچ کے طور پر سجانے کے لیے اپنے تمام تر ابلاغی، سیاسی اور سفارتی ترکش کے تیر اندھا دھند چلا دیے گئے۔

ظلم کی اس اندھیر نگری میں المیہ یہ نہیں کہ دنیا اس سفاکیت سے ناواقف ہے، بلکہ اصل ماتم اس مجرمانہ خاموشی کا ہے جو کہیں مصلحت کے بوجھ تلے دبی ہے، کہیں طاقت کے خوف سے سہم گئی ہے اور کہیں ذاتی سیاسی مفادات کے بھنور میں غرق ہو چکی ہے۔ بے حس انسانوں دنیا کے ضمیر پر مفاد پرستی کے جو تالے پڑے ہیں، ان کی گونج میں مظلوموں کی فریاد کہیں دب کر رہ گئی ہے۔

مگر ظلم کی اس تاریک رات میں بھی امید کے کچھ ایسے دیے ٹمٹما رہے ہیں جو ہوا کے ہر طوفان اور دباؤ کی ہر دیوار کو چیر کر حق کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں۔ خال خال ہی سہی مگر کچھ ایسے باضمیر انسان آج بھی موجود ہیں جنھوں نے مذہب، نسل اور جغرافیہ کی تمام حدوں کو پھلانگ کر صرف اور صرف سچائی کو اپنا قبلہ بنایا ہے۔ ان حق پرستوں نے غاصب صہیونی ریاست کے چہرے پر چڑھا شرافت کا نقاب نوچ ڈالا ہے اور دنیا کو یہ آئینہ دکھایا ہے کہ کس طرح یہ قاتل ریاست مظلومیت کا ڈھونگ رچا کر انسانیت کا خون چوس رہی ہے اور اپنے مکارانہ ایجنڈے کو دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر آگے بڑھا رہی ہے۔

انھی ناموں میں ایک یہودی مذہب سے تعلق رکھنے والے 'ایال وائزمین' بھی ہیں جنھوں نے "غزہ میں اسرائیلی نسل کشی کی انجینیئر نگ" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب میں ایک ایسے دل دہلا دینے والے سچ کا پردہ چاک کیا ہے جسے دنیا سے چھپانے کے لیے غاصب صہیونی ریاست نے اپنے تمام تر مکروہ حربے آزما دیے۔ برطانوی اسرائیلی معمار اور بلند پایہ محقق ایال وائزمین کی یہ کتاب محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ یہ اس منظم سفاکیت اور 'شیطانی انجینئر نگ' کا کڑوا سچ اور مستند مرقع ہے جس کے ذریعے ایک زندہ قوم کی مادی ہستی کو مٹانے اور اس خطے کے نقشے کو خون کے آنسوؤں سے بدلنے کی ہولناک سازش رچی گئی۔

جب مظلوم بین الاقوامی عدالتوں کی دہلیزیں انصاف کی بھیک مانگتے مانگتے تھک جائیں،

جب طاقت کے ایوانوں میں مظلوموں کی فریاد کو سفارتی مصلحتوں کی نذر کر دیا جائے اور جب غزہ کے اجڑے کوچہ و بازار سے اٹھنے والا دھواں عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے میں ناکام نظر آئے، تب حقائق کی یہ دستاویزی کتاب تاریخ کے سینے پر ایک گہرے زخم کی طرح ابھرتی ہے۔ اگرچہ مغربی دنیا کے ان گنت باضمیر انسانوں کی روحیں اس سچ سے آگاہ ہیں کہ پچھلے تین برسوں سے اس خطے پر جو قیامت صغریٰ برپا کی گئی ہے، وہ صریحاً نسل کشی کا بھیانک روپ ہے، مگر غاصبوں کے حواریوں کی ہٹ دھرمی نے انصاف کے ہر دروازے پر تالے لگا دیے ہیں۔

عالمی عدالتِ انصاف میں سچ کی آواز کو امریکی اور یورپی مفادات کے بوٹ تلے کچلا گیا۔ اصطلاحات کے گورکھ دھندے میں اصل المیے کو الجھا دیا گیا، سچ بولنے والے طالبعلموں کے احتجاجی شعلوں کو طاقت کے اندھے حربوں کے استعمال سے دبا دیا گیا۔ ایسے تاریک دور میں ایال وائزمین کی یہ تحریر ایک ایسا چراغ بن کر جلتی ہے جو گلی گلی، گھر گھر اور ہسپتال کے ملبے سے اٹھنے والی اس سچی کہانی کو دنیا کے سامنے بے نقاب کرتی ہے جسے مٹانے کے لیے ظالموں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

درندگی کی یہ گھناؤنی داستان حادثہ نہیں، پرانی روش کا تسلسل

اسرائیلی ریاست کی یہ سفاکانہ کارروائیاں کوئی اچانک پھٹنے والا طوفان نہیں ہیں، بلکہ یہ اس گہری سوچ اور مجرمانہ انجینیئر نگ کا تسلسل ہیں جو دہائیوں سے اس خطے کے خلاف پروان چڑھائی جا رہی ہے۔ مصنف ہزاروں ایسی تصاویر، خونچکاں ویڈیوز اور چشم دید گواہیوں کے انبار سامنے لاتا ہے جن کی بنیاد پر اس کی ٹیم نے غزہ کی تباہی کا ایک ایسا ڈیجیٹل نقشہ تیار کیا ہے جو ظالموں کے چہرے سے ہر نقاب نوچ لیتا ہے۔

تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے وہ یاد دلاتا ہے کہ وہی غزہ جو کبھی 1948ء سے پہلے مشرق وسطیٰ کی دھرتی پر زرخیزی اور شادابی کا استعارہ ہوا کرتا تھا، اسے کس طرح نکبہ کے عذاب، 1967ء کے نکسہ کے ظلم اور پھر 2007ء سے مسلط کردہ اس ظالمانہ محاصرے کی چکی میں پیسا گیا جس کا مقصد صرف اور صرف انسانوں پر عرصہ حیات تنگ کرنا تھا۔

سات اکتوبر کے اس ہولناک واقعے نے اگرچہ صہیونی معاشرے کو انتقام اور درندگی کی ایک ایسی تاریک کھائی میں دھکیل دیا جہاں انسانیت کا نام ونشان مٹ گیا، مگر وائزمین پوری جرات کے ساتھ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ غزہ کی یہ تباہی کسی نئی جنگ کا آغاز نہیں تھی، بلکہ یہ اسی پرانی خون آشام روش کا تسلسل تھی جو برسوں سے اس مظلوم خطے کی رگوں میں اتاری جا رہی تھی۔ کتاب کا وہ حصہ جو اسلامی تحریک مزاحمت 'حماس' اور قابض فوج کے درمیان سرنگوں کی اس طویل جنگ کا احاطہ کرتا ہے، اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ بار بار کی جانے والی یہ فوجی یورشیں اس عسکری نیٹ ورک کو تو کیا مٹاتی، الٹا اس نے غاصبوں کے لیے تباہی کے نئے بہانے ضرور فراہم کر دیے۔

شہری زندگی کے ہر چراغ کو بجھا دینے کی مجرمانہ انجینیئر نگ

اس خوفناک انجینیئر نگ کا سب سے تاریک پہلو یہ ہے کہ اس نے صرف مورچوں اور جنگجوؤں کو اپنا ہدف نہیں بنایا، بلکہ اس نے ہنستے بستے گھروں، معصوم بچوں کے سکولوں، پناہ گزینوں کے ڈیروں اور انسانیت کی آخری امید بنے ہوئے ان ہسپتالوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ ہر وہ جگہ جہاں بے بس فلسطینی پناہ لینے کی کوشش کرتے، جہاں زندگی کی رمق باقی تھی اسے وحشیانہ پن سے تاخت وتاراج کیا گیا۔

یہ کتاب کسی عام فکشن کی طرح نہیں لگتی بلکہ یہ ایک ہولناک مجرمانہ تحقیقاتی دستاویز کی مانند ہے جو بتاتی ہے کہ کس طرح بلڈوزروں کے ذریعے ہنستے بستے محلوں کو زمین بوس کیا گیا، زیتون کے صدیوں پرانے باغات کو جلا کر راکھ کیا گیا، انسانوں کو بار بار ایسے بے آب وگیاہ صحراؤں کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا جنہیں محفوظ پناہ گاہوں کا جھوٹا نام دیا گیا تھا۔

وائزمین اس بات پر زور دیتا ہے کہ غزہ کا یہ سانحہ صرف لاشوں کی گنتی یا ملبے کے حجم کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ اس پوری کائنات اور ماحول کے مسخ ہو جانے کا ماتم ہے جہاں پانی کے چشمے، مٹی کی خوشبو اور سانس لینے کے بنیادی حق تک کو جنگی ہتھیار بنا کر استعمال کیا گیا۔ وہ اس مکروہ لفظ 'نسل کشی' کے دائرے کو وسیع کرنے کا پرزور مطالبہ کرتا ہے، تاکہ اس میں صرف انسانوں کے خون کی ہولی ہی نہیں، بلکہ اس دھرتی کے ماحولیاتی نظام، اس کے بنیادی ڈھانچے اور ان تمام رشتوں کا قتلِ عام بھی شامل ہو جائے جو زندگی کی بقا کی ضمانت دیتے ہیں۔

یہ کتاب اس تلخ حقیقت کی غماز ہے کہ جب تک دنیا اس مجرمانہ انجینیئر نگ کے اصل چہرے کو نہیں پہچانے گی، اس وقت تک مظلوموں کے زخموں پر مرہم رکھنا ناممکن رہے گا۔ غزہ آج بھی اس سچ کی گواہی دے رہا ہے کہ عمارتیں مٹ سکتی ہیں، جسم کٹ سکتے ہیں، مگر سچی اور زندہ قوموں کے خوابوں کو کوئی ظالم کبھی راکھ نہیں کر سکتا۔

ایال وائزمین کی یہ حق گوئی پر مبنی کاوش صہیونی جلادوں کی طرف انسان دشمن دنیا کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ ہے۔ ایک یہودی ہو کر وائزمین نے اپنے نام کی طرح وہ کارنامہ انجام دیا اس بے حس دنیا میں جس کی نظیر نہیں ملتی۔ وائزمین نے جس جرات اور بے باکی کے ساتھ فلسطینی قوم کی مظلومیت کا مقدمہ پیش کیا اور مکروہ صہیونی ریاست کے سفاک چہرے سے نقاب نوچا ہے بلاشبہ وہ اس پر دادِ تحسین کا مستحق ہے۔

میڈیا واچ: ابوالعین

ہمارے قلم اسرائیل کے لیے حاضر ہیں

حق وصداقت کا گلا گھونٹنا اور مظلوم کی آواز کو دبانا ہمیشہ سے جابر قوتوں کا پرانا ہتھیار رہا ہے، لیکن غزہ پر نازل ہونے والی قیامتِ صغریٰ کے دوران مغرب کے نام نہاد آزاد میڈیا نے غیر جانب داری کی جو دھجیاں اڑائی ہیں، تاریخ میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ جب انسانیت سوز بمباری سے غزہ کی زمین کو فلسطینیوں کے لیے مقتل اور ملبے کا ڈھیر بنایا جا رہا تھا، تو دوسری طرف مغرب کے کارپوریٹ میڈیا رومز میں الفاظ، سرخیوں اور زاویہ ہائے نظر کے ذریعے ایک بے رحم نسل کشی پر پردہ ڈالنے کی منظم سازش جاری تھی۔ حقائق کو مسخ کرنے اور ظالم کو مظلوم بنا کر پیش کرنے کی اس بھیانک صحافتی خیانت نے نہ صرف عالمی برادری کے ضمیر کو سلایا بلکہ میڈیا کی اخلاقی خودکشی کی ایک ایسی داستان رقم کی جس نے صحافت کے مقدس پیشے کو ہمیشہ کے لیے داغدار کر دیا۔

یہ تقریباً تین سال پہلے کی بات ہے جب غزہ میں نسل کشی اور اسے ملبے میں تبدیل کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ میڈیا کے بڑے صارفین نے حقیقت حال کو ایک طرف کر دیا اور انہوں نے غلط رپورٹوں، تجزیوں اور تبصروں کو یکطرفہ غزہ کوریج کے لیے مخصوص کر لیا۔ اسرائیل کی بمباری، گولہ باری اور میزائیل حملوں سے اسرائیل کی فوج نے جو ہولناک مناظر پیدا کیے تھے، ان کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنے میڈیا کے لیے خبروں کا پیٹ بھرنے کے لیے دیگر غیر اہم موضوعات کو اپنی توجہ مرکز بنا لیا۔

حال ہی میں دو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں:

The Comlicit Lensاور

US Media, Coverage of Israeli Army's Genocide in Gazaاور آدم ایچ جانسن شامل ہیں۔ ان کے مصنفین رابن اینڈرسن ہیں۔ ان دونوں کتابوں کو بہت غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ دوسروں تک ان کو پہچانا اور بہ طور ریفرنس استعمال میں لانا چاہیے۔

دونوں کتابیں منفرد، مضبوط اور مؤثر پہلوؤں سے غزہ میں نسل کشی کو سامنے لاتی ہیں جب ان کو یکجا کیا جائے، تو یہ کتابیں بہت جامع، تفصیلی اور تباہ کن نسل کشی پر تنقیدی امور سامنے لاتی ہیں۔ ان میں امریکی میڈیا کی لینڈ سلائیڈ، سپورٹ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ یہ سپورٹ میڈیا کے کارپوریٹ مراکز، مقتدرہ کے میکانزم سب میڈیا کے کردار کے قانونی پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے۔ اس صورت حال نے امریکہ اور اسرائیل کی مشترکہ نسل کشی کو بے نقاب کیا ہے۔

دونوں مصنفین فلسطین کی جدوجہد آزادی کی میڈیا کوریج اور ٹیموں کے معروف نام ہیں۔ اینڈرسن فورڈ ہام یونیورسٹی میں میڈیا سٹڈیز کے پروفیسر ہیں۔ وہ Board of Fairness and Accuracy in Reporting (FAIR) کے رکن بھی ہیں۔ جانسن میڈیا اینالسٹ ہیں۔ (FAIR) کے لیے مبصر کے طور پر کام کرتے ہیں۔ وہ پوڈ کاسٹ CITATION NEEDED میں شریک میزبان بھی ہیں۔

اینڈرسن کی کتاب The Complete Lense کے حوالے سے بھی معروف ہیں اور فلسطین امریکی حلقوں میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ انہیں ان حلقوں میں عزت و

احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ رشید خالدی فلسطینی مصنف کے ساتھ اچھا تعلق رکھتے ہیں۔انہوں نے کتاب HSW TO SELLS GWNOCIDE کا پیش لفظ بھی تحریر کیا ہے۔ وہ ہیومن رائٹس کے اٹارنی ہیں۔انہوں نے نورا ایراکٹ کے ساتھ مل کر کتاب پر قانونی حوالوں سے اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

رشید خالدی نے نیویارک ٹائمز کے مدیران اور رپورٹرز کے اس کردار کا جائزہ لیا ہے جو انہوں نے نسل کشی کے دوران میں ادا کیا۔ وہ نام نہاد اخبار کے ریکارڈ پر بھی کام کرتے رہے ہیں۔اس طرح وہ غزہ میں نسل کشی کی مہم رپورٹنگ کرتے رہے ہیں اور اس طرح اسرائیل کی حمایت میں سرگرم رہے ہیں۔ ایراکٹ نے ایک قدم آگے بڑھ کے کارپوریٹ میڈیا کے ایگزیکٹوز کے لیے تجویز کیا کہ وہ مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے جنیوا کنونشن برائے نسل کشی کے آرٹیکل جرائم سے کس طرح سے بچ سکتے ہیں جب کہ وہ نسل کشی کی تصویر ساری جانب داری سے پیش کرتے رہے ہوں۔

ممنوع الفاظ کا چناؤ اور استعمال:

ایڈیٹرز اور رپورٹرز کو خصوصی ہدایات دی جاتی ہیں کہ کارپوریٹ میڈیا کی وقعت کو نقصان پہنچانے والے، غیر مانوس الفاظ اور تراکیب پر باقاعدہ زور دیا جاتا ہے کہ کسی رپورٹنگ یا آرٹیکل دیتے ہوئے اس میں بیان کردہ نفس مضمون کو نقصان پہنچانا ہے۔ باقاعدہ الفاظ و تراکیب بتائے جاتے ہیں جو خصوصی ٹیم تیار کرتی ہے۔ یہ بھی بیان کر دیا جاتا ہے کہ معروف الفاظ کو کس طرح سے نظر انداز کرنا ہے۔ اینڈرسن اور جانسن اس نوعیت کی رپورٹنگ پر سوالات اٹھاتے ہیں۔

Taboo الفاظ جیسے Genocide کا استعمال کرنے سے روکا جاتا ہے۔آپ پورا نیو یارک ٹائمز یا واشنگٹن پوسٹ پڑھ جائیں، آپ کو یہ لفظ شاید ہی کسی خبر، رپورٹ، تجزیے میں ملے گا۔ اسی طرح نسلی صفائی کا استعمال بھی روک دیا جاتا ہے جس طرح بوسنیا کی یکطرفہ خانہ جنگی میں دیکھا گیا۔اسی طرح سے الفاظ Slaughteor, Carrage اور Massacre جیسے الفاظ بھی روک دیے جاتے ہیں۔ فلسطینی شہادتوں میں جاں بحق کا لفظ استعمال کرنے کے بجائے اموات کا لفظ استعمال کیا جاتا رہا ہے اور ہو رہا ہے۔اس بارے میں Times کا ایک ہدایت نامہ بھی دیکھا جا سکتا ہے جو ایڈیٹرز بین الاقوامی ایڈیٹرز کو جاری کیا گیا۔

اینڈرسن کا کہنا ہے کہ 7 اکتوبر سے 24 نومبر 2023ء کے درمیانی عرصے میں اسرائیلیوں کی مبینہ اموات بیان کرنے کے لیے Massacre کا لفظ 53 بار استعمال کیا گیا۔ فلسطینیوں کے مارے جانے کے بارے میں یہ لفظ صرف ایک بار استعمال کیا گیا۔

اینڈرسن اور جانسن دونوں CNN کی ایک مثال دیتے ہیں۔ اسے پہلے The Intercept نے رپورٹ کیا۔اس کے ساتھ یہ کہا گیا کہ اس رپورٹ سے متعلقہ سارا مواد پہلے یروشلم بیورو کو بھیجا جائے تاکہ اسرائیل کے ایڈیٹرز اس کا جائزہ لیں۔

BBC اور دیگر برطانوی میڈیا اس طرح متعصب رہے۔ یہ اس قدر متعصب میڈیا ثابت ہوا کہ BBC کی ایک رپورٹ یروشلم آفس کو ارسال کی گئی۔ جب وہاں سے رپورٹ ایڈیٹنگ کے بعد واپس آئی تو اس پر BBC کے ہی آٹھ صحافیوں نے شدید اعتراضات کیے۔ انہوں نے دیکھا کہ Massacre کا لفظ تبدیل کر دیا گیا۔ اسی طرح atrocity کا لفظ تبدیل کر دیا گیا۔ یہ کہا گیا کہ حماس اسرائیل کے خلاف کارروائی ہو تو یہ لفظ استعمال کیا جائے۔ اسرائیلی فوجیوں کی کارروائیوں میں اس لفظ کو ہرگز استعمال نہ کیا جائے۔اس وقت تک اسرائیلی فوج 14,500 فلسطینی شہید کر چکی تھی۔ان میں 600 بچے بھی شامل تھے۔احتجاج کرنے والے آٹھ صحافی اس مرتبہ اس لیے خاموش رہے کہ انہیں ملازمت سے نکالے جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

اسی طرح خبر یا رپورٹ کے پس منظر پر بھی بہت زور دیا گیا۔ 7 اکتوبر کا بار بار حوالہ دینے پر پابندی لگا دی گئی۔ ''مقبوضہ علاقوں'' کا ذکر کرنے سے روک دیا گیا۔مثال کے طور پر نیویارک ٹائمز نے ایسے کسی بھی پس منظر کو خبر کا حصہ بنانے پر پابندی لگا دی۔

سرکاری میڈیا مسلسل لکھتا اور کہتا رہا کہ حماس نے حملہ کر کے unprecedented نقصان پہنچایا۔ اینڈرسن کا کہنا ہے کہ میڈیا کہتا رہا کہ حماس نے کسی اشتعال کے بغیر حملہ کیا۔گویا 7 اکتوبر سے پہلے کا 17 سال کا محاصرہ اور ناکہ بندی کسی نوعیت کا اشتعال ہی نہ تھا۔ یہ ناکہ بندی اب بھی جاری ہے، اس کے باوجود یہ عمل unprovoked تھا۔

اسرائیلی وزیر اعظم بنیامین نیتن یاہو اقوام متحدہ کے اجلاس سے اسرائیل کے نئے نقشے کے ساتھ آئے، اس میں مقبوضہ مغربی کنارے اور غزہ کو اسرائیل کا حصہ دکھایا گیا۔ گویا اسرائیل کی فلسطینیوں کو اجتماعی سزا دی جا رہی تھی اور یہ ان کا حق تھا۔

امریکی اخبارات نے برطانوی میڈیا سمیت 1948ء کے نکبہ کا ذکر ہی نہیں کیا جس میں ہزاروں فلسطینی مارے اور بے دخل کر دیے گئے تھے۔غزہ کی اکثریتی آبادی اپنے گھروں سے بے دخل کر دی گئی۔صیہونی حملوں نے کوئی عمارت نہ چھوڑی جسے تباہ نہ کر دیا گیا ہو۔ 1948ء میں ہجرت پر مجبور کیے جانے والوں کو اب تک واپسی کا حق تک مل نہ سکا۔

اینڈرسن نے وضاحت کی کہ حکومت کے زیر اثر میڈیا 7 اکتوبر کو اسرائیلی حملے کا آغاز کرنے والوں کے لیے انعامات کا اعلان کیا۔

الجزیرہ کی انگلش شعبہ کی تحقیقات اس طرح کی سکروٹنی جانسن نے نوٹ کی۔انہوں نے اس دوھرے معیار (Double Standard) کو بے نقاب کیا۔اس دوھرے معیار کا اظہار سرکاری امریکی میڈیا نے استعمال کیا۔

جانسن کے مطالعہ میں یہ بات بھی آئی کہ MSNBC کے Morning میں کسی ایک بھی فلسطینی کو میزبان Joe پیش نہیں کیا یہ لوگ اکتوبر 2023ء سے اکتوبر 2024ء تک سارے پروگرام اسی طرح پیش کرتے رہے۔ جب کہ دوسری طرف ٹی وی پروگرام بار بار غزہ کا ذکر کرتے رہے۔ اس شو کے ایک مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اکتوبر 2023ء کے بعد پہلے 6 ماہ میں فلسطین کا لفظ ایک بار بھی نہیں لیا۔

اس دوران میں ''اسرائیلی یرغمالی'' کا لفظ 835 مرتبہ جبکہ ''فلسطینی قیدی'' کا لفظ 52 مرتبہ لیا گیا۔ یہ بھی قیدیوں کے تبادلہ کے دنوں میں ذکر کیا گیا جب کہ اتوار کے صبح کے پروگراموں میں امریکی نیٹ ورکس ABC, CSS, NBC اور CNN نے اکتوبر 2023ء کے بعد ایک سال میں Night کا لفظ 149 مرتبہ استعمال کر کے اسرائیلی کارروائیوں کا تذکرہ کیا گیا۔

اسرائیلی جنگی جہازوں نے Al-Roya Tower پر مغربی غزہ میں اس وقت بار بار حملے کیے گئے جب وہ خالی کیا جاچکا تھا۔ یہ حملے 8 ستمبر 2025ء تک کیے جاتے رہے۔ اس عمارت میں فلسطینی سنٹر فار ہیومن رائٹس کے دفاتر ہوتے تھے، میڈیا دفاتر، میڈیکل کلینک، سپورٹس کی سہولتیں اور دیگر سول اداروں کے دفاتر تھے۔

یوسب زانون کا معاملہ:

امریکی میڈیا نے معروف یہودی اصطلاح Anti-Semitism کا ذکر 65 گنا زیادہ مرتبہ کیا اور اسلام فوبیا یا مسلم دشمن کا لفظ صرف چار مرتبہ کیا گیا۔

جانسن نے Anti-Semitism کے لفظ کے ہتھیار کے طور پر استعمال کا بھی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق دی نیو یارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ، سی این این، ایسوسی ایٹڈ پریس، دی لاس اینجلس ٹائمز، یو ایس اے ٹوڈے، پولیٹیکو اور Axios نے اکتوبر 2023ء کے بعد پہلے چھ ماہ میں 372 آرٹیکلز میں اس یہودی اصطلاح کو شامل کیا جب کہ مسلمانوں کے بارے میں لفظ Bigotry کا چار بار استعمال کیا گیا۔

جانسن نے بتایا کہ اس نوعیت کے کاموں کی حرکیاتی اہمیت یہ تھی کہ اپنی بار بار امریکی کالجوں میں استعمال کیا گیا۔ جانسان اور اینڈرسن نے فلسطینی صحافیوں کو خراج تحسین پیش کیا کہ انہوں نے جو دیکھا، اسی طرح بیان کر دیا۔ ان صحافیوں کو اگست 2025ء تک قتل کیا جاتا رہا۔ پہلے چھ ماہ میں اوسطاً روزانہ ایک فلسطینی صحافی قتل کیا گیا۔ الجزیرہ کے مطابق 278 صحافی قتل کیے گئے۔ یہ سب کے سب فلسطینی صحافی تھے۔ پہلے مہینوں میں اسرائیل نے 100 صحافی گرفتار کیے۔ ان میں سے نصف سے زیادہ قید کر لیے گئے۔

جن کتابوں کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، خالدی اور ایراکت نے ان کا بلاواسطہ حوالہ دیا۔ جب ان حقائق کا جائزہ لیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی تفصیل، اعداد اور جائزے ایسے نہیں کہ ان میں سے کو ہذف کیا جائے لیکن یہ سب کچھ اس قدر ہولناک ہے کہ ان کا سرسری مطالعہ کرنے سے ہی روح کانپ اٹھتی ہے، اس لیے بہت اہم باتیں چھوڑنا پڑی ہیں۔ جب یہ خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر حسام الصفیہ اور ان کے ساتھ کام کرنے والے ڈاکٹروں کا کردار سامنے آتا ہے تب بھی یہی سوچ ابھرتی ہے کہ ان کو خراج تحسین پیش کرنا کوئی کارنامہ نہیں۔ لیکن افسوس عالم جانتا ہی نہیں کہ کیا قیامت گزر گئی اور اسرائیلی دجال نیتن یاہو اب بھی دندناتا پھر رہا ہے۔

لیکن غزہ کے میدان کارزار سے پرے بھی بہت کچھ ہے جو توجہ طلب ہے۔ گزشتہ دو سالوں میں امریکہ میں ہونے والے پول سروے بھی بہت اہم ہیں۔ فروری 2026ء میں امریکہ میں گیلپ سروے سے معلوم ہوا کہ 41 فیصد امریکیوں کی ہمدردیاں پہلی بار فلسطینی اور بالخصوص غزہ کے لوگوں کے ساتھ تھیں۔

PEW ریسرچ سنٹر کے سروے پول کے مطابق 23 فیصد امریکی بالغ رائے دہندگان نے اسرائیل اور 87 فیصد نے فلسطینیوں کے حق میں فیصلہ دیا۔ جو کچھ بھی ہوا، اس میں کسی تبدیلی کا امکان کوئی نہیں ہے۔ ہر کوئی اپنے مفادات سے چمٹا ہوا ہے۔ انصاف سے بات کرنے کا دعویٰ کرنا ناانصافی کی انتہا سے بھی نیچے گر گئے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ فلسطینیوں کی نسل کشی ضروری ہوئی اور نظر آئی لیکن امریکہ و برطانیہ کے میڈیا کی خودکشی کا تماشا دنیا نے نہیں دیکھا اور نہ ہی دیکھ سکے گی۔ غزہ کے میدانِ کارزار سے اٹھنے والے دھوئیں اور خون میں لت پت لاشوں کے درمیان اگرچہ ایک طویل اور دردناک جدوجہد جاری ہے، لیکن روبن اینڈرسن اور آدم ایچ جانسن جیسے حق گو تجزیہ نگاروں نے مغربی میڈیا کی اس دغابازی کو بے نقاب کر کے ضمیرِ انسانی کو جھنجھوڑنے کی قابلِ قدر کوشش کی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بندوقیں خاموش ہو جاتی ہیں اور عمارتوں کا ملبہ ہٹا دیا جاتا ہے، تب بھی الفاظ اور تاریخ کا ریکارڈ قائم رہتا ہے۔ غزہ کے غیور اور مظلوم عوام نے تو اپنی جانیں دے کر تاریخِ حریت میں اپنا نام جاوداں کر لیا، لیکن امریکی و برطانوی میڈیا نے جو غیر جانب داری اور سچائی کا جنازہ اٹھایا ہے، اس کی خودکشی کا داغ اب کبھی دھل نہیں سکے گا۔ انصاف کے تمام دعوے اب ملبے کے نیچے دب چکے ہیں اور دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ صحافت جب مقتدرہ کی غلام بن جائے تو وہ خود نسل کشی میں برابر کی شریک بن جاتی ہے۔

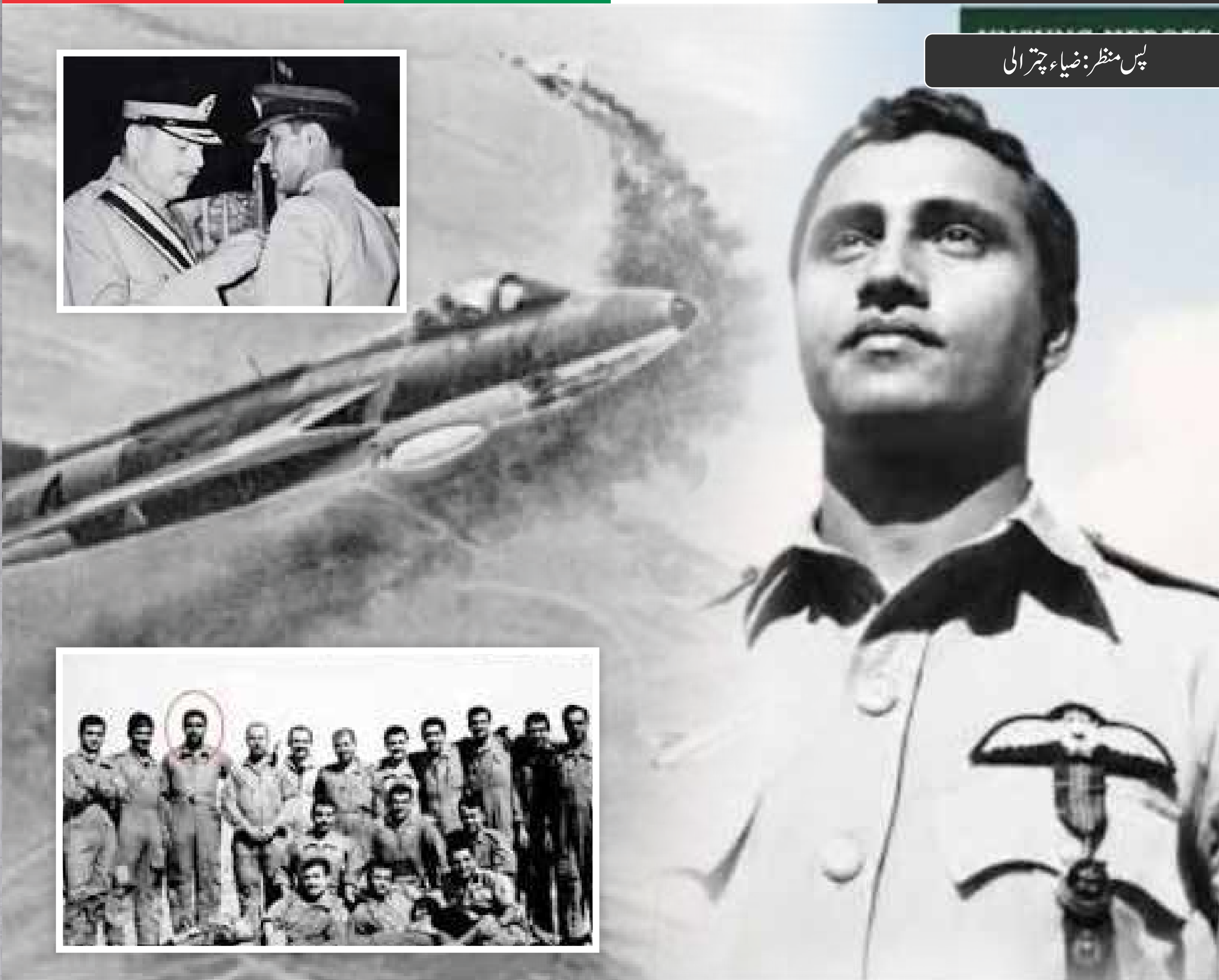

پس منظر: ضیاء چترالی

سیف الاعظم: عظیم گمنام پاکستانی ہیرو

دنیا کی عسکری تاریخ میں چار مختلف ممالک کی فضائی افواج سے وابستہ رہنے والے پائلٹوں کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان میں ایک نمایاں نام دوسری جنگِ عظیم کے پولش ہوا باز بولیسلا وگلاڈچ کا ہے، جبکہ دوسرا نام پاکستان کے سیف الاعظم کا ہے۔ لیکن سیف الاعظم کی داستان اس لیے غیر معمولی ہے کہ انہوں نے چار فضائی افواج سے وابستہ رہنے کے ساتھ ساتھ جنگی آسمانوں میں بھی اپنی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیلی فضائیہ کے تین جنگی طیارے مار گرائے۔ یوں دجالی فضائیہ کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے کا ریکارڈ قائم کیا۔

لیکن عزیمت کی اس لازوال داستان کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جس مسلمان ہیرو کو عرب دنیا، خصوصاً فلسطینی حلقے، آج بھی یاد کرتے ہیں، ہم پاکستانی اسے بھلا چکے ہیں۔

ہر چند دن بعد کسی نہ کسی عرب یا فلسطینی سوشل میڈیا پیج پر سیف الاعظم کی تصویر، ان کا تعارف یا 1967ء کے جنگی کارنامے کا ذکر دوبارہ سامنے آجاتا ہے۔ مگر پاکستان میں نئی نسل کے کتنے لوگ جانتے ہیں کہ سیف الاعظم کون تھے؟

یہ محض ایک فائٹر پائلٹ کی کہانی نہیں، بلکہ ایک ایسے مسلم سپاہی کی قابل رشک داستان ہے جس نے مشکل وقت میں عرب مسلمانوں کے ساتھ کھڑے ہو کر تاریخ میں اپنا نام ثبت کیا۔

پاکستان سے عرب محاذ تک

سیف الاعظم 1941ء میں برطانوی ہندوستان کے مشرقی بنگال کے علاقے پابنا میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پاکستان ایئر فورس میں شمولیت اختیار کی اور فائٹر پائلٹ کی حیثیت سے تربیت حاصل کی۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ میں انہوں نے جنگی مشنز میں حصہ لیا اور ایک بھارتی Folland Gnat جنگی طیارہ مار گرایا۔ ان کی کارکردگی پر حکومت پاکستان کی جانب سے انہیں ستارۂ جرأت سے نوازا گیا۔

1966ء میں انہیں اردن بھیجا گیا، جہاں وہ رائل اردن ایئر فورس کے ساتھ خدمات انجام دینے لگے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ چند ماہ بعد یہی پاکستانی پائلٹ عرب اسرائیل

جنگ کے آسمانوں میں ایک غیر معمولی کارنامہ انجام دے گا۔

مفرق کا آسمان

5 جون 1967ء کو اسرائیل اور عرب ممالک کے درمیان چھ روزہ جنگ شروع ہوئی۔ اسرائیلی فضائیہ نے عرب ممالک کے فضائی اڈوں پر شدید حملے کیے۔

اردن کے مفرق ایئربیس پر حملے کے دوران سیف الاعظم نے اردنی فضائیہ کے Hawker Hunter میں پرواز کی۔ سامنے اسرائیلی فضائیہ کے Dassault Mystère IV طیارے تھے۔

فضائی معرکے میں سیف الاعظم نے ایک اسرائیلی Mystère کو نشانہ بنا کر مار گرایا، جبکہ دوسرے طیارے کو بھی نقصان پہنچایا۔

ایک پاکستانی پائلٹ نے عرب فضائیہ کے طیارے میں بیٹھ کر اسرائیلی فضائیہ کے خلاف پہلی بڑی فتح حاصل کر لی تھی۔

مگر یہ صرف آغاز تھا۔

عراق میں دو مزید فتوحات

7 جون 1967ء کو اسرائیلی فضائیہ نے عراق کے H-3 ایئربیس پر حملہ کیا۔ سیف الاعظم عراق پہنچ چکے تھے اور عراقی فضائیہ کے Hawker Hunter میں سوار ہو کر اسرائیلی طیاروں کا مقابلہ کیا۔

اس مرتبہ ان کے سامنے اسرائیلی فضائیہ کے جدید Mirage III اور Vautour طیارے تھے۔

فضائی معرکے میں سیف الاعظم نے ایک اسرائیلی Vautour بمبار مار گرایا اور اس کے بعد ایک Mirage III کو بھی نشانہ بنایا۔ یوں 1967ء کی جنگ میں ان کے نام اسرائیلی فضائیہ کے تین جنگی طیارے درج ہو گئے:

Mystère IV، Vautour اور Mirage III۔

یہاں ایک اہم بات واضح رہنی چاہیے۔ سوشل میڈیا پر کبھی سیف الاعظم کے نام چار یا اس سے زیادہ اسرائیلی طیارے گرانے کے دعوے کیے جاتے ہیں، لیکن پاک فضائیہ کے معتبر ریکارڈ میں تین طیاروں کی فتوحات سب سے مضبوط طور پر دستاویزی ہیں۔

چار فضائی افواج

سیف الاعظم کی زندگی کا ایک اور حیرت انگیز پہلو ان کا چار ممالک کی فضائی افواج سے تعلق ہے:

پاکستان۔ اردن۔ عراق اور بنگلہ دیش

دنیا کی عسکری تاریخ میں ایسے پائلٹ بہت کم ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے پولش فائٹر پائلٹ بولیسلا وگلاڈچ (Bolesław Gładych) بھی پولینڈ، فرانس، برطانیہ اور امریکہ کی فضائی افواج کے ساتھ وابستہ رہے۔

لیکن سیف الاعظم کی داستان کا اپنا ایک منفرد رنگ ہے۔ انہوں نے پاکستان کے بعد دو عرب مسلم ممالک کی فضائی افواج میں خدمات انجام دیں، اسرائیلی فضائیہ کے خلاف جنگی کارروائیوں میں حصہ لیا اور پھر 1971ء کے بعد بنگلہ دیش ایئر فورس کا حصہ بن گئے۔

جسے ہم بھول گئے، عربوں نے یاد رکھا

یہاں سیف الاعظم کی داستان تاریخ سے نکل کر ہمارے اجتماعی حافظے پر ایک سوال بن جاتی ہے۔

ہم نے اپنے اس مسلم ہیرو کو کتنا یاد رکھا؟

ہماری نئی نسل دنیا بھر کے کھلاڑیوں، اداکاروں اور سوشل میڈیا شخصیات کے نام جانتی ہے، مگر کتنے پاکستانی نوجوان سیف الاعظم کا نام جانتے ہیں؟

کتنے لوگ جانتے ہیں کہ ایک پاکستانی پائلٹ نے 1967ء میں عرب محاذ پر اسرائیلی جنگی طیارے مار گرائے تھے؟

اور اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ عرب دنیا نے انہیں ہم سے زیادہ دیر تک یاد رکھا۔

فلسطینی اور عرب سوشل میڈیا صفحات پر آج بھی وقفے وقفے سے ان کی تصویر اور 1967ء کی جنگ کا ذکر سامنے آتا ہے۔ فلسطینیوں کے لیے وہ اس دور کی ان شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اسرائیل کے خلاف عربوں کے مشکل وقت میں ان کا ساتھ دیا۔

یہی وجہ ہے کہ ان کا نام فلسطینی حلقوں میں محض ایک پاکستانی فوجی کے طور پر نہیں بلکہ ایک مسلم ہوا باز اور عربوں کے ساتھی کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

ایک زندگی، چار پرچم

سیف الاعظم کی زندگی ایک عجیب تاریخی سفر ہے۔

پاکستان میں تربیت اور جنگی تجربہ، اردن میں اسرائیل کے خلاف پہلا فضائی معرکہ، عراق میں دو مزید فتوحات، اور پھر بنگلہ دیش کی فضائیہ میں خدمات۔

چار فضائی افواج، کئی جنگی محاذ اور ایک پائلٹ۔

14 جون 2020ء کو سیف الاعظم 79 برس کی عمر میں بنگلہ دیش میں انتقال کر گئے۔

مگر ان کی داستان آج بھی زندہ ہے۔

اور شاید اس داستان کا سب سے بڑا سبق یہی ہے کہ قومیں صرف نئے ہیروز پیدا کر کے نہیں، اپنے پرانے ہیروز کو یاد رکھ کر بھی زندہ رہتی ہیں۔

سیف الاعظم کو یاد کرنا محض ایک فوجی پائلٹ کو یاد کرنا نہیں؛ یہ اپنی تاریخ کے اس باب کو یاد کرنا ہے جس میں ایک پاکستانی مسلمان نے عرب مسلمانوں کے مشکل وقت میں ان کا ساتھ دیا۔

عرب دنیا آج بھی ان کا ذکر کرتی ہے۔

فلسطینی حلقوں میں آج بھی ان کی داستان سنائی دیتی ہے۔

اور ہمیں خود سے یہ سوال پوچھنا چاہیے:

جسے عرب آج بھی یاد رکھتے ہیں، ہم نے اسے کیوں بھلا دیا؟

سیف الاعظم کی داستان کو مبالغے کی ضرورت نہیں۔

چار فضائی افواج سے وابستگی، عرب محاذوں پر جنگی خدمات اور 1967ء میں اسرائیلی فضائیہ کے تین جنگی طیارے۔ یہ سب کچھ اپنے آپ میں ایک غیر معمولی مسلم ہیرو کی داستان ہے۔

سیف الاعظم۔ ہمارا بھلایا ہوا شاہین، جسے عرب اور فلسطین آج بھی یاد رکھتے ہیں۔

اللہ کی کروڑوں رحمتیں ہوں ان کی لحد پر۔

براہ راست رپورٹ: وقاص بل

فلسطین کا اصل نقشہ: ہاکان پر دجال برہم

ترک وزیر خارجہ ہاکان فیدان کی لیبیا کے دارالحکومت طرابلس میں لیبیا کی قومی اتحاد حکومت کے وزیراعظم عبدالحمید الدبیبہ سے ملاقات کی ایک تصویر نے دجال کے تن بدن میں آگ لگا دی ہے۔ دوران ملاقات دونوں رہنماؤں کے پس منظر میں بحیرۂ روم سے دریائے اردن تک تاریخی فلسطین کا نقشہ نمایاں تھا، جبکہ ساتھ موجود ایک تختی پر ''عائدون إلى فلسطين التاريخية'' (ہم تاریخی فلسطین کی طرف واپس آنے والے ہیں) درج تھا۔

دجالی وزارت خارجہ نے اس تصویر کو بنیاد بنا کر ہاکان فیدان پر سخت حملہ کیا اور الزام عائد کیا کہ پس منظر میں موجود نقشہ ''اسرائیل کو مکمل طور پر مٹا دیتا ہے''۔ دجالی وزارت خارجہ نے سوشل میڈیا پلیٹ فارم ایکس پر فیدان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ ''لیکچر دینے اور دھمکیاں دینے کی زحمت سے بچ سکتے ہیں''۔ اسرائیل نے ترکی پر حماس کی میزبانی اور اس کے رہنماؤں کو پناہ دینے کا الزام بھی عائد کیا اور کہا کہ غزہ کے حوالے سے اسرائیل کے سیکورٹی انتظامات طے کرنے میں ترکی کا کوئی کردار نہیں۔

دجالی وزارت خارجہ نے مزید کہا کہ اس کے نزدیک غزہ کے لیے واضح راستہ حماس کو غیر مسلح کرنا اور غزہ کو اسلحے سے پاک علاقہ بنانا ہے اور اسرائیل حماس کو دوبارہ اپنی عسکری صلاحیتیں بحال کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔

تصویر میں موجود تاریخی فلسطین کے نقشے نے سوشل میڈیا پر بھی خاصی توجہ حاصل کی۔ صارفین نے نقشے پر مسجد اقصیٰ اور القدس کی نشاندہی، ''عائدون'' یعنی ''ہم واپس آنے والے ہیں'' کے الفاظ اور سب سے بڑھ کر نقشے پر ''اسرائیل'' کا نام موجود نہ ہونے کو سیاسی علامت قرار دیا۔ بعض مبصرین کے نزدیک تصویر میں موجود یہ تمام عناصر فلسطین، القدس اور حقِ واپسی کے حوالے سے واضح علامتی پیغام رکھتے ہیں۔

یہ تصویر ایک ایسے وقت سامنے آئی ہے جب ترکیہ اور اسرائیل کے درمیان کشیدگی مسلسل بڑھ رہی ہے۔ فیدان نے جمعرات کو اپنے مصری ہم منصب بدر عبدالعاطی کے ساتھ مشترکہ پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ ترکی اور مصر نے غزہ کے حوالے سے مزید سنجیدہ اقدامات کرنے پر اتفاق کیا ہے۔ ان کے مطابق غزہ کا مسئلہ اب صرف فلسطین یا مشرقِ وسطیٰ تک محدود نہیں رہا بلکہ پوری عالمی برادری کے لیے ایک اہم سیکورٹی مسئلہ بن چکا ہے۔

فیدان نے اسرائیلی وزیرِاعظم بنیامین نیتن یاہو اور ان کی حکومت پر انسانی وقار کی خلاف ورزی کرنے والی پالیسیوں کو آگے بڑھانے کا الزام عائد کرتے ہوئے کہا کہ اس کی پالیسیاں عالمی برادری کے صبر کو تقریباً اس حد تک پہنچا رہی ہیں جہاں شدید ردِعمل پیدا ہوسکتا ہے۔

ترکی اور مصر نے غزہ کے لیے جن اقدامات پر اتفاق کیا ہے، ان میں فوری انسانی امداد کی فراہمی، فلسطینیوں کو نشانہ بنانے اور ان کے قتل کی روک تھام اور غزہ سے متعلق امن منصوبے کی شرائط پر عمل درآمد شامل ہیں۔

تاریخ دانی: محمد زاہد (قسط3)

تاریخِ مسجد اقصیٰ: تقدس، عظمت اور تاریخی ارتقاء

مسجدِ اقصیٰ مسلمانوں کا قبلۂ اول، مکہ و مدینہ کے بعد تیسرا مقدس ترین مقام اور تاریخِ انسانی کا ایک عظیم ترین مرکز ہے۔ یہ صرف ایک عمارت کا نام نہیں بل کہ یہ صدیوں پرانی تہذیب، انبیاء کی سرزمین اور اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

پھر ہم نے تمھیں ان پر غلبہ دے کر تمہارے دن پھیرے اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد کی اور تمہاری تعداد پہلے سے بڑھا دی۔ اگر تم نے بھلے کام کیے تو اپنے ہی فائدے کے لیے کیے اور اگر تم نے برے کام کیے تو وہ بھی تمہارے ہی لیے (وبال) بن گئے۔ پھر جب دوسری میعاد کا وقت آیا (تو ہم نے دوسرے دشمن بھیجے) تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح داخل ہوں جس طرح پہلی بار داخل ہوئے تھے اور جس چیز پر ان کا زور چلے اسے تباہ کر کے رکھ دیں۔ امید ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم کرے، لیکن اگر تم نے پھر وہی (سرکشی) کی تو ہم بھی پھر وہی (عذاب) کریں گے، اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا رکھا ہے۔" [سورہ الاسراء: 4-7]

پہلی تنبیہ (وعید)

اللہ نے بنی اسرائیل کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ انہیں اقتدار اور وقار کا وہ مقام دیا جائے گا جسے وہ آخرکار برائی اور فساد پھیلانے کے لیے استعمال کریں گے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد حکمران ظالم، بدعنوان اور متکبر ہو گئے تھے، اور کچھ لوگ تو بت پرستی میں بھی مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ بار بار بنی اسرائیل کو توبہ کے مواقع دیتا رہا اور انہیں اپنی نعمتوں سے نوازتا رہا، لیکن وہ بار بار نافرمانی کی طرف لوٹتے رہے۔

یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ان تنبیہات میں سے پہلی اس وقت پوری ہوئی جب بنی اسرائیل اپنی طاقت اور عظمت کے عروج پر تھے۔ یہ وہ دور تھا جب حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت (Goliath) کو شکست دے کر سلطنت قائم کی تھی۔ اس میں وہ دور بھی شامل ہے جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے سلطنت کو اس مقام تک پہنچایا جس کی مثال دوبارہ کبھی نہیں دیکھی جائے گی۔ ان کی بادشاہت کئی ممالک تک پھیلی ہوئی تھی، اور وہ ہواؤں، جانوروں اور جنات پر بھی حکمرانی کرتے تھے۔

اس کے بعد، بنی اسرائیل بگڑ گئے، ان کا زوال شروع ہوا اور اسرائیل کی سلطنت 586 قبل مسیح میں بخت نصر کے ہاتھوں نیست و نابود ہو گئی، جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ مسجدِ اقصیٰ (جسے یہودی غلط طور پر 'ہیکلِ سلیمانی' کہتے ہیں) مکمل طور پر تباہ کر دی گئی اور گلیوں میں خون بہہ گیا جب ستر ہزار سے زائد لوگ قتل کر دیے گئے اور بہت سے دوسرے لوگوں کو غلام بنا کر بابل لے جایا گیا۔ روایت ہے کہ یہ امام سعید بن مسیبؒ (حضرت ابو ہریرہؓ کے داماد اور جلیل القدر تابعی) کا موقف ہے۔

بخت نصر نے سابقہ بادشاہ کے خاندان کے ایک فرد کو اپنے نائب کے طور پر شہر کا حکمران مقرر کیا تھا۔ یہ نیا بادشاہ انتہائی بدعنوان تھا اور بتوں کی پوجا کرتا تھا۔ اس نے بخت نصر کے خلاف بغاوت کر دی جس نے اس کے غصے کو دوبارہ بھڑکا دیا۔ وہ واپس آیا، پہلے سے بھی زیادہ لوگوں کو قتل کیا، تمام جائیدادیں تباہ کر دیں اور پورے شہر کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ بنی اسرائیل اپنا (سب کچھ) کھو چکے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، بنی اسرائیل بابل میں غلامی کی ذلت کی زندگی گزارتے رہے اور مسجدِ اقصیٰ تباہ حال رہی۔

اسی دوران افق پر سلطنتِ فارس (ایران) کا عروج ہو رہا تھا۔ انہوں نے 550 قبل مسیح میں بابلیوں پر حملہ کیا اور انہیں شکست دے دی۔ کچھ یہودی یروشلم واپس آ گئے جبکہ دوسروں نے فارس میں ہی رہنے کو ترجیح دی۔ فارس کے بادشاہ خسرو (سائرس) نے یہودیوں کو شام واپس جانے اور یروشلم میں دوبارہ آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ روایت ہے کہ اس نے مسجدِ اقصیٰ کی دوبارہ تعمیر میں ان کی اجازت اور مدد بھی کی۔ یہ وہ دور تھا جس میں رومیوں اور فارسیوں کے درمیان جنگیں شدت اختیار کر چکی تھیں۔ یہودی قدرتی طور پر رومیوں کے خلاف فارسیوں کے حلیف بنے اور ان کی مدد کی۔

سکندرِ اعظم کے حملے سے پہلے ان زمینوں پر فارسیوں کا کنٹرول 200 سال تک قائم رہا۔

دوسری تنبیہ (وعید)

کلاسیکی یا روایتی نقطہ نظر سے، دوسری تنبیہ سے مراد وہ دور ہے جب بابلی عہد کے بعد بنی اسرائیل دوبارہ اقتدار میں آئے، یہاں تک کہ وہ دوبارہ فساد میں مبتلا ہوئے اور پھر رومیوں کے ہاتھوں تباہ ہوئے اور یروشلم سے نکال دیے گئے۔

امام قتادہؒ کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ:

''بنی اسرائیل دوبارہ سرکشی کی طرف لوٹ آئے، تو اللہ نے ان کے خلاف اس گروہ (محمد ﷺ اور ان کے صحابہ) کو بھیج دیا، جنہوں نے ان سے ذلت و مغلوبیت کے ساتھ جزیہ وصول کیا۔''

جہاں تک دوسری تنبیہ کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر اس وقت یا اس طریقے کا ذکر نہیں فرمایا کہ بنی اسرائیل کی طرف سے یہ دوسرا فساد کیسے برپا ہوگا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا (بشمول رومی سلطنت کے ہاتھوں ان کا زوال) وہ سب پہلی تنبیہ کا حصہ تھا، اور دوسری تنبیہ ایک ایسی پیشگوئی ہے جس کا پورا ہونا ابھی باقی ہے۔ وہ کیسے؟

مفسرین کی اکثریت نے ان آیات کی تشریح اپنے اپنے دور کے حالات کے مطابق کی ہے۔ آج کل بہت سے مفسرین دوسری سرکشی (فساد) سے متعلق آیات کی تشریح موجودہ دور کے حالات کی روشنی میں کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ: ان آیات میں اللہ کا دوسرا وعدہ جو پورا ہو کر رہے گا اور اسرائیل کی تباہی کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہ یہ حصہ ہے: ''تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح داخل ہوں جس طرح پہلی بار داخل ہوئے تھے''۔ ہمارے تناظر میں، وہ مسلمان ہی تھے جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خلافت میں یروشلم میں داخل ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے سینکڑوں سال ان زمینوں پر حکومت کی جہاں یہودی اور عیسائی بھی خوش حال رہے۔ وقت کے ساتھ، اگرچہ یروشلم کئی سالوں تک صلیبیوں کے قبضے میں بھی رہا، لیکن یہ کبھی بھی اس طرح یہودیوں کے مکمل اختیار میں نہیں رہا جیسا کہ آج قابض ریاستِ اسرائیل کے زیرِ اثر ہے۔ اس آیت اور اس کی موجودہ قرأت کی بنیاد پر، اللہ کا وعدہ ہے کہ مسلمان دوبارہ یروشلم کی مسجدِ اقصیٰ میں اسی طرح داخل ہوں گے جیسے ہم پہلے اسے فتح کرتے وقت داخل ہوئے تھے۔

رومی تسلط سے خلافتِ عمری تک

اس دور میں یونانی اس حد تک غالب آ گئے تھے کہ تورات کا ترجمہ بھی یونانی زبان میں کر دیا گیا۔ اسی طرح عہد نامہ قدیم (Old Testament) کا مشہور ترجمہ 'سیپٹوجینٹ' (Septuagint) وجود میں آیا۔ سکندرِ اعظم کی فتوحات کے نتیجے میں مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے ملاپ سے ایک نئی تہذیب اور ثقافت ابھری جسے 'ہیلینیزم' (Hellenism) کہا جاتا ہے۔ یہ تہذیب 300 سال سے زائد عرصے تک قائم رہی، جس کے دوران مشرقِ وسطیٰ اور سکندر کے زیرِ قبضہ دیگر علاقوں نے نہ صرف یونانی زبان، ثقافت اور تعلیم سے فائدہ اٹھایا بلکہ اپنی مقامی ثقافتوں میں بھی ان خصوصیات کو جذب کر لیا۔

اس عرصے کے دوران، یہودیوں نے مختلف گروہوں میں بٹ کر یروشلم کو فتح کرنے کی کوشش کی لیکن مسلسل خانہ جنگی کی وجہ سے وہ زیادہ کچھ نہ کر سکے۔ 63 قبل مسیح میں رومیوں نے یروشلم کو فتح کر لیا۔ فلسطین اور پڑوسی علاقوں کو رومی صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اسی دور میں (نام نہاد) دوسرے ہیکلِ سلیمانی کی توسیع دیکھی گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی دور کے آس پاس معجزانہ طور پر پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی قوم کو صرف ایک اللہ کی طرف بلایا اور ان کے معاملات کی اصلاح کی کوشش کی۔ بنی اسرائیل نے انہیں مصلوب کرنے کی کوشش کی لیکن اللہ نے انہیں بچا لیا اور آسمانوں پر اٹھا لیا۔ ان کے زمانے میں فلسطین یہودیوں، صابیوں، مشرکین اور رومیوں پر مشتمل تھا۔

مئی 66 عیسوی میں رومی سلطنت کے خلاف ایک بڑی بغاوت ہوئی۔ رومیوں نے اس بغاوت کو کچل دیا، یروشلم کا محاصرہ کیا اور بالآخر پورے شہر کو مکمل طور پر ملیامیٹ کر دیا۔ اس موڑ پر بچ جانے والے یہودیوں کو فلسطین سے نکال دیا گیا۔

70 عیسوی میں رومیوں نے مسجدِ اقصیٰ کو ایک بار پھر تباہ کر دیا اور اسے رومی بتوں کی پرستش گاہ میں تبدیل کر دیا۔ 65 سال بعد، 135 عیسوی میں 'بار کوخبا' بغاوت کے دوران، رومیوں نے بنی اسرائیل کا قتلِ عام کیا اور مسجد (یا ہیکل) کی بنیادوں تک کو کھود ڈالا۔

آہستہ آہستہ، عیسائیت رومی سلطنت میں پھیلنا شروع ہوئی یہاں تک کہ 315-320 عیسوی کے درمیان رومی شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت قبول کر لی۔ اب یہودیت کے بعد عیسائیت یروشلم کی نئی وارث تھی۔ یہودیوں کے خلاف رومیوں کی دشمنی مزید شدت اختیار کر گئی کیونکہ انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قاتل تصور کیا جاتا تھا۔

اس طرزِ حکمرانی کے تقریباً 300 سال بعد، سلطنتِ فارس (ایران) نے حملہ کر کے 614 عیسوی میں یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس حملے میں یہودیوں نے فارسیوں کی مدد کی اور اندرونی طور پر تخریب کاری کی، جس کے نتیجے میں زیادہ تر گرجا گھروں کو زمین بوس کر دیا گیا۔ انہوں نے 'کنائس القیامۃ' (Church of the Holy Sepulchre) پر چھاپہ مارا، اسے لوٹا اور ''حقیقی صلیب'' (True Cross) کو اپنے دارالحکومت مدائن (Ctesiphon) لے گئے۔ اسی دور میں مکہ مکرمہ میں نبی کریم ﷺ نے پیشگوئی فرمائی تھی کہ رومی دوبارہ یروشلم فتح کر لیں گے، جیسا کہ سورہ روم میں نازل ہوا۔ (جاری ہے)

بچوں کا منتظر باپ...

کل دجالی قید سے کئی فلسطینی رہا ہوئے۔ ان میں ایک عبدالکریم السیقلی بھی تھے۔ دو سال بعد لوٹے۔ جیسے ہی قیدیوں کو لانے والی بس آئی تو یہ بڑی بے تابی سے نیچے اترے اور دیوانہ وار ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ یہ سوچ کر کہ دو سال بعد اپنے لخت جگروں کو گلے لگاؤں گا تا کہ قید کے غم کی تلافی ہو سکے...... مگر استقبال کے لیے بچے نہیں، ان کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ منتظر تھے!

عبدالکریم کا تعلق خان یونس سے ہے۔ رہائی کے بعد ان کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اپنے بچوں کو سینے سے لگانے آرزوؤں کا خون ہو گیا۔ ان کی گرفتاری کے بعد دجالی بمباری میں ان کا گھر نشانہ بنا اور 6 بچے ایک ساتھ شہید ہو گئے، جبکہ ان کی اہلیہ اور ایک بیٹی زخمی ہو کر زندہ بچ گئیں۔ شہید ہونے والے بچوں میں ایک شیر خوار بچی اور جڑواں بچے بھی شامل تھے۔

سوچیے......!

ایک باپ دو سال تک قید کی تاریک کوٹھڑی میں اس امید کے ساتھ زندہ رہا کہ ایک دن آزادی ملے گی، گھر لوٹے گا اور اپنے بچوں کو گلے سے لگائے گا۔ مگر آزادی ملی تو گھر اجڑ چکا تھا، بچے جا چکے تھے اور باپ کے حصے میں صرف ان کی موت کی دستاویزات رہ گئی تھیں۔

یہ دراصل غزہ کے ان ہزاروں خاندانوں کی تصویر ہے، جنہوں نے جنگ میں اپنے پیاروں کو کھویا اور ان گنت لوگوں کی بھی، جو قید سے نکل کر اپنے گھروں کے بجائے ملبے، قبریں اور شہادت کی خبریں دیکھنے پر مجبور ہوئے۔

احمد عبدالکریم السیقلی جیل سے آزاد ہو گئے...... مگر ان کے چھ بچے ان کی رہائی کی خوشی دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہ سکے۔

یا اللہ! غزہ کے ان چھلنی جگر باپوں کو صبر عطا فرما جنہوں نے اپنے بچوں کو میں کھویا۔
یہ غم الفاظ سے بڑا ہے...... بہت بڑا!

"غزہ کے 21546 شہید بچے"

یومیہ ایک شہید کا جنازہ پڑھائے جائے تو 59 سال اور گیارہ دن لگ جائیں گے

7 اکتوبر 2023ء سے جاری نسل کشی میں اب تک غزہ میں 21,546 بچے شہید ہو چکے ہیں۔ یہ تعداد اتنی بڑی ہے کہ ایک سو اسی (180) متوسط درجہ کے پرائمری اسکولوں میں پڑھنے والے ٹوٹل بچوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ ان شہید بچوں میں سے ایک ایک کا جنازہ یومیہ پڑھا جائے تو 59 سال اور 11 دن لگ سکتے ہیں۔

القدس اور مسجد اقصیٰ کے محقق ڈاکٹر عبداللہ معروف عمر کہتے ہیں: "کیا آپ جانتے ہیں کہ اگر غزہ میں شہید ہونے والے ہر بچے کے جنازے میں شرکت کی جائے، تو آپ کو 59 سال تک ہر روز ایک جنازے میں جانا پڑے گا۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہر روز صرف ایک بچے کا جنازہ پڑھا جائے تو یہ سفر 59 سال اور 11 دن تک جاری رہے گا۔

ذرا تصور کیجیے!

ایک انسان بچپن سے بڑھاپے تک کا پورا زمانہ گزار دے، نسلیں بدل جائیں، بال سفید ہو جائیں، دنیا کا نقشہ بدل جائے، لیکن غزہ کے شہید بچوں کے جنازے ختم نہ ہوں۔

اس سے آپ نسل کشی کی اس وحشت ناک صورت حال کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ ایک پوری نسل کی تباہی کا قصہ ہے۔ ہزاروں ادھورے خوابوں، معصوم مسکراہٹوں، خالی جھولوں، سنسان اسکولوں اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جانے والی ننھی آوازوں کی داستان ہے۔

غزہ کے بچے محض گنتی کے عدد تو نہیں، بلکہ وہ ماؤں کی دعائیں، باپوں کی امیدیں اور امت کے زخمی دل کی دھڑکنیں ہیں۔

اللّٰهم ارحم أطفال غزة، واحفظ من بقي منهم، واكتب للشهداء الفردوس الأعلى

اسرائیلی قید خانوں میں مظلوم فلسطینی خواتین پر بہیمانہ مظالم

حراستی مراکز میں تذلیل، تشدد اور ہولناک ناانصافی کی داستان